رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۲۰۳

شعبان المعظم ۱۳۷۰ھ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے — قیمت فی پرچہ دس آنے

رسائل ومسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین پر مولانا نے ہر طرح کے سوالات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

جلد شائع ہو رہی ہے

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۳۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جن لوگوں نے قرآن اور حدیث کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں اصل اہمیت فرد کی ہے نہ کہ جماعت یا اجتماعی نظام کی۔ ہر ہر فرد انسانی کو اللہ تعالیٰ نے شخصیت عطا کی ہے، خودی کا احساس دیا ہے، انفرادی خصوصیات بخشی ہیں، دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں سننے کے لیے کان دیئے ہیں، سوچنے، سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لیے دل دیا ہے، خواہش، تمیز، ارادہ اور فیصلے کی قوتیں دی ہیں، اور اپنی ملکیت میں سے بہت سی چیزیں امانۃً اس کے سپرد کر کے ان پر اختیارات اسے عطا کیے ہیں۔ اس بنا پر ایک ایک انسان منفرداً اللہ کا خلیفہ ہے اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ یہی بات ہے جسے قرآن بار بار دہراتا ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ۔ کُلُّ امْرِئٍ بِمَا کَسَبَ رَهِیْنٌ۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، لَهَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ۔ یہ سب اسی حقیقت کے اعلانات ہیں۔ اور اسی کو اس مشہور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ اَلَا کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ پھر اسی بات کو قرآن آخرت کے ذکر میں بکثرت بیان کرتا ہے کہ اللہ کی عدالت میں ایک ایک انسان انفرادی حیثیت سے اپنا حساب دیگا اور جو کچھ برائی یا بھلائی اس نے دنیا کی زندگی میں کمائی تھی اس کا نتیجہ دیکھے گا۔ یعنی جس طرح شخصیت انفرادی ہے اور ذمہ داری انفرادی ہے اسی طرح نتیجہ و انجام بھی آخرکار انفرادی ہی ہے اور اس نتیجہ و انجام کے خوب یا زشت ہونے اور خوبی و زشتی کے مختلف مدارج میں سے کسی درجہ پر پہنچنے کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس نے دنیا کی زندگی میں کس قسم کی شخصیت اپنے اندر پرورش کی، کن صفات کا اکتساب کیا، کس طرح ان قوتوں سے کام لیا جو اللہ نے اسے دی تھیں، کس طرح اُس

امانت میں اپنے اختیارات استعمال کیے جو اللہ نے اسے سونپی تھی، اور اپنی تکمیل کے لیے اُن ذرائع سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جو اسے حاصل تھے۔

پس یہ حقیقت ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے، خدا کی عبدیت اور اطاعت کی طرف فرد کو دعوت دی گئی ہے، حقوق اور فرائض فرد پر عاید کیے گئے ہیں، امر و نہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں، طاعت پر جزا کی امید فرد کو دلائی گئی ہے اور عصیان پر سزا کی دھمکی بھی فرد ہی کو دی گئی ہے۔ اس نظامِ فکر و عمل میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کو ابتدا میں عامل کی حیثیت سے اور انتہا میں نتیجۂ عمل پانے والے کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی کی عقل اور جذبات سے یہ اپیل کرتا ہے، اسی کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا مخاطب بناتا ہے، اسی کی فلاح کا طالب ہے اور اسی کو خسران سے بچانا چاہتا ہے۔ اگر فرد اپنی جگہ ناقص رہ جائے اور اپنی شخصیت کو پستی میں گرا دے تو آخری فیصلہ میں اُس جماعت اور اجتماعی نظام کی خوبی اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتی جس سے وہ دنیا میں تعلق رکھتا تھا، بلکہ اگر وہ کسی اچھی جماعت اور صالح اجتماعی نظام سے وابستہ تھا اور پھر اس نے اپنی تکمیلِ ذات اور ارتقاءِ شخصیت کے ان مواقع سے فائدہ نہ اٹھایا جو اسے حاصل تھے تو یہ چیز اس کے خلاف ایک اور قوی دلیل بن جائے گی اور اسے اور زیادہ خسران میں مبتلا کرے گی۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنی کوشش سے اس کمال کو پہنچ جائے جس کو وہ پہنچ سکتا تھا اور اپنی شخصیت کو اتنا بہتر نشو و نما دے جتنا وہ دے سکتا تھا، تو جماعت اور اجتماعی نظام کا فساد اس کی فلاح و نجات میں مانع نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ چیز اس کے حق میں ایک دلیل ہو گی کہ اس نے ناموافق حالات میں ترقی کے لیے اتنی کامیاب جد و جہد کی۔ یہی معنی ہیں اس آیت کے جو سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوئی ہے کہ علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم۔ اور اس کے عکس کی صحت پر خود اسی آیت کا مضمون دلالت کرتا ہے یعنی یہ کہ لَا ینفعکم من اھتدیٰ اذا ضللتم۔

وصول جس کے ساتھ کسی کمال کے حصول اور کسی شخصیت کے ارتقاء کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آخر کوئی شخص اس سے کہاں تک پرہیز کر سکتا ہے جب کہ ایک کافرانہ نظامِ سیاست نے کامل تسلط حاصل کر کے پوری پوری قوموں کو کفر اور ظلم اور فساد کی خدمت پر مجبور کر دیا ہو؟ پس فرد کی نجات و فلاح بہت مشکل بلکہ محال ہے اگر اس کی ترقی اور تکمیل کے راستے سے ان موانع کو دور نہ کیا جائے جو ایک بگڑی ہوئی جماعت اور ایک فاسد نظامِ اجتماعی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں، اور ایک ایسا صالح اجتماعی نظام نہ قائم کر دیا جائے جو اس تکمیل اور ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے۔ اور اسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ترقی اور تکمیل کا راستہ ہی اجتماعی زندگی کے اندر رکھا ہے نہ کہ اس کے باہر۔ فرد کی وہ امتحان گاہ جس میں اسے اپنی لیاقت یا نالائقی ثابت کرنی ہے۔ اور جس میں کامیابی یا ناکامی ہی پر آخرت میں اس کی فلاح و خسران کا مدار ہے، کسی خلوت کدے یا کسی سنسان جنگل میں واقع نہیں ہے بلکہ حیاتِ اجتماعی کے عین منجدھار میں واقع ہے۔ اس کو اکیلا نہیں رکھا گیا ہے بلکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ بےشمار تعلقات کے رشتوں میں باندھ دیا گیا ہے۔ وہ کسی کا بیٹا، کسی کا بھائی، کسی کا شوہر، کسی کا باپ، کسی کا دوست، کسی کا دشمن، کسی کا ہمسایہ، کسی کا اجیر، کسی کا مستاجر، کسی کا حاکم، کسی کا محکوم، کسی کا بائع، کسی کا مشتری، کسی کا امین، کسی کا موتمن بنایا گیا ہے۔ اور اس کا امتحان ہی اس امر میں ہے کہ ان تعلقات میں بندھ کر، ذمہ داریوں اور امانتوں کے بوجھ سے لد کر، خوف و طمع، محبت اور غضب، امیدوں اور مایوسیوں کے ماحول میں رہ کر وہ کس طرح اللہ کے عائد کردہ حقوق اور فرائض ادا کرتا ہے، کس طرح اس کے مقرر کردہ حدود پر قائم رہتا ہے، کس طرح خلافت کے اس منصب سے عہدہ برا ہوتا ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے، کن صفات کا اکتساب کرتا ہے، کن خصوصیات کو اپنے اندر نشوونما دیتا ہے اور اپنی سیرت و کردار کے کیسے نقوش دنیا میں چھوڑ کر جاتا ہے۔ نیکی کا جو تصور اسلام پیش کرتا ہے وہ ہر معنی سے خالی ہو جاتا ہے اگر فرد کو اجتماعی زندگی سے الگ کر لیا جائے۔ جس شخص نے تمدنی تعلقات کے جتنے کم شعبوں میں قدم رکھا ہے اور جتنی کم ذمہ داریاں لی ہیں، اس نے گویا اسی قدر کم پرچوں میں امتحان دیا ہے اور اس لحاظ سے اپنی شخصیت کو اتنے ہی پہلوؤں میں تکمیل کے مواقع سے محروم کر لیا ہے جتنی کہ

میں بھی تغیر آگیا ہے، نقطۂ نظر بھی محدود ہو گیا ہے، اور تزکیۂ نفس کے طریقے بھی اُن طریقوں سے مختلف ہو گئے ہیں جو عہدِ نبوت میں اختیار کیے گئے تھے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ تزکیۂ نفس کے بڑے بڑے ادارے اور سلسلے مدتوں سے قائم ہیں اور انکی برکت سے بڑی بڑی پاکیزہ شخصیتوں کے انسان بھی پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن اس پیمانے کے انسان ابھی تک تیار نہ ہو سکے جو جاہلیت کی راہوں پر دنیا کو چلانے والی زبردست قوتوں کے مقابلہ میں اُٹھیں اور اُن سے زور آزمائی کر کے اسلام کو دنیا کا راہنما و کارفرما دین بنانے کی کوشش کریں اور یہ تو خیر بہت بڑا کام ہے، یہاں تو ایسے انسان بھی فراہم نہ ہو سکے جو کم از کم اتنا ہی کر سکتے کہ اسلام کے دائرۂ نفوذ و اثر میں جاہلیت کی قاہرانہ پیش قدمی کو روک دیتے۔ بڑے بڑے نفوسِ زکیہ موجود تھے۔ اور موجود ہیں جو اپنے علم اور اپنی دیانت، اپنی پرہیزگاری اور اپنی پاکیزہ زندگی کے لیے یقیناً خراجِ تحسین کے مستحق ہیں، لیکن ان نفوس کی موجودگی ہی میں جاہلیت اپنی تلوار سے، اپنے قلم سے، اپنے علوم و فنون سے، اپنی تہذیب اور اپنے تمدن سے نہ صرف دنیا کو بلکہ خود مسلمان ملکوں اور قوموں کو بھی فتح کرتی چلی گئی ہے اور چلی جا رہی ہے۔ آخر اس کمزوری کا کوئی سبب تو ضرور ہے، اور جو سبب بھی ہے اس کی تحقیق میں بے جا عقیدت مانع نہ ہونی چاہیے۔

ہمارے ہاں ایک بڑے گروہ کے نزدیک تزکیۂ نفس کا مقصد یہ رہا ہے کہ اسی زندگی میں مشاہدۂ حق نصیب ہو جائے اور ایمان بالغیب کے مقام سے ترقی کر کے ایمان بالشہادت کی دولت حاصل ہو۔ ظاہر نظر میں یہ ایک بلند ترین اور پاکیزہ ترین مقصد ہے، لیکن قرآن نے کہیں ہم کو یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم اسے مقصود قرار دے کر اپنی کوشش اس راہ میں صرف کریں۔ بلکہ اس کے برعکس اگر ہم بطورِ خود اسے مقصود قرار دے بھی لیں تو قرآن ہمیں یقین دلاتا ہے کہ یہ گوہرِ مقصود اس زندگی میں نبی کے سوا کسی کے ہاتھ نہیں آسکتا۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (یعنی خفائقِ غیب کا جاننے والا اللہ ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا بجز اس رسول کے جس کو اُس نے خود منتخب کیا ہو، پھر وہ اس کے آگے اور پیچھے نگرانی

نگرانی کرنے والے فرشتے لگا دیتا ہے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان رسولوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پردۂ غیب میں چھپی ہوئی حقیقتوں، یا بالفاظِ دیگر مابعد الطبیعی حقیقتوں کے مشاہدہ کی کوشش فضول بھی ہے، غلط بھی اور اس کے کامیاب ہونے کا بھی امکان نہیں ہے۔ انسان کو ان حقائق کے جتنے اور جس قدر علم کی ضرورت تھی اللہ نے وہ علم اپنے رسولوں کے ذریعہ سے دے دیا ہے اور یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس طرح اُس نے انسان کو ان چیزوں کی تلاش و جستجو کی زحمت سے بچا دیا۔ اب انسان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ رسولوں کے دیے ہوئے علم پر ایمان بالغیب لائے اور جو خدمات اس کے سپرد کی گئی ہیں انہیں اطمینان کے ساتھ انجام دینے میں لگا رہے۔ لیکن اگر اس پر بھی کوئی شخص خواہ مخواہ یہ زحمت اٹھانا ہی چاہے تو اس کی حیثیت خدا کے بلائے ہوئے مہمان کی نہ ہوگی کہ اس کے لیے دروازے کھولے جائیں اور پردے اٹھائے جائیں، بلکہ اس کی حیثیت ایک نقب زن کی سی ہوگی جو خود روزن بنا کر اندر جھانکنا چاہتا ہو۔ سو اللہ کے حرم میں اس نقب زنی کی کوشش ظاہر ہے کہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر بالفرض کوئی اس حرم کی سرحد کے قریب پہنچ بھی گیا تو رسولوں کے لیے حفاظت و نگہبانی کا جو غیر معمولی انتظام کیا جاتا ہے اس سے تو وہ بہر حال محروم ہی ہوگا اس لیے وہ جو تھوڑی بہت حقیقت کی جھلک وہ دیکھے گا اُس میں نفس کی غلط فہمیوں، نظر کے دھوکوں اور شیاطین کی دراندازیوں کے بے شمار خطرات ہوں گے جن کی بدولت عجب نہیں کہ ایمان بالشہادت کی نعمت پانے کے بجائے ایمان بالغیب کی دولت سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے۔

اس سے فروتر [illegible] مقصد بتایا جاتا ہے وہ روحانی ترقی ہے، مگر یہ "روحانی ترقی" کچھ ایسی مبہم اور پُراسرار چیز ہے کہ تمام عمر بھی ان گلیوں میں گشت لگانے کے بعد بھی آدمی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کس مقام پر پہنچا۔ اس کی اصطلاحیں، اس کی منزلیں، اس کے ثمرات و نتائج سب رموز ہیں جن کو ہم جیسے عامی کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ ہاں اگر کچھ نظر آتا ہے تو وہ صرف یہ کہ اس راہ میں جو منزلیں طے کی جاتی ہیں ان میں وہ منزل کبھی نہیں آتی جسے بلالؓ اور عمارؓ اور صہیبؓ نے طے کیا تھا اور نہ وہی منزل کبھی آنے کی توقع کی جا سکتی ہے جس کو ابوبکرؓ و عمرؓ نے طے کیا۔

اسلام کے مقصد سے قریب ترین مقصد اُن لوگوں کا ہے جو تزکیۂ نفس سے تقویٰ کا حصول چاہتے ہیں

(باقی صفحہ ۱۳۲ پر)

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۰ | شوال، ذیقعدہ ۱۳۷۲ھ۔ مطابق جولائی اگست ۱۹۵۳ء | عدد ۴، ۵

ابوالخیر مودودی نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور سے
شائع کیا

اسلام کا فلسفۂ تاریخ

عبدالحمید

تاریخ اقوام وملل کے عروج و زوال کی ایک دلچسپ مگر عبرتناک داستان ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کن کن اسباب کی بنا پر قومیں دنیا میں ترقی کرتی ہیں اور کونسی کمزوریاں انہیں قعرِ ذلت میں لے جاتی ہیں۔

انہی اسباب کی چھان بین برسوں سے جاری ہے مگر آج تک ان کا صحیح طور پر تعین نہیں ہو سکا۔ بعض مفکرین قوموں کے عروج و زوال کو صرف جغرافیائی حالات کا نتیجہ سمجھتے ہیں[1] بعض اسے محض بخت واتفاق سے تعبیر کرتے ہیں، بعض اسے ایک اچھی لیڈر شپ کی کرشمہ سازی خیال کرتے ہیں۔ ایک صاحب[2] نے بڑے ہی غور کے بعد فرمایا کہ اس دنیا میں بناؤ اور بگاڑ کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے وہ صرف روحِ مطلق (Absolute Spirit) کے سفرِ ارتقا کی وجہ سے ہے۔ ان کے بعد ایک دوسرے مفکر[3] نے بڑے زور سے یہ دعویٰ کیا کہ دنیا کے سارے انقلابات کے پیچھے صرف معاشی محرکات ہی کام کر رہے ہیں۔

اسلام ایک الگ ضابطۂ حیات ہونے کی وجہ سے اس معاملہ میں بھی اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتا ہے جو مبادیات سے لے کر تفصیلات تک دوسروں سے بالکل مختلف ہے۔ اس مضمون میں ہم اسی نظریہ کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس کے متعلق کسی تفصیلی گفتگو کرنے سے پیشتر مناسب یہ ہے کہ ہم ایک نگاہ اُس حیثیت پر بھی ڈال لیں جو دنیا کے مختلف فلسفے انسان کو اس کائنات میں دیتے ہیں۔ اس سے اس مسئلہ کے سمجھنے میں بہت حد تک آسانی ہوگی۔

مغربی مفکرین فکر و نظر کے باہمی اختلافات کے باوجود جس معاملہ میں ایک دوسرے کے ہمنوا ہیں

---

[1] بکل Buckle   [2] ہیگل Hegel   [3] مارکس Marx

دعویٰ کہ ان کے نزدیک اصل حقیقت صرف اجتماعیت ہے، انفرادیت اُن کے خیال میں محض ایک سراب ہے۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سماج ایک نامیہ (Organism) ہے جس میں فرد ایک خلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بیچارہ اسی رخ پر چل سکتا ہے جس طرف اجتماعیت اُسے اجازت دے۔ اُس کا اپنا الگ کوئی وجود نہیں۔ شپنگلر نے اسی نظریہ کو پیش کیا ہیگل (Hegel) نے تھوڑے سے تغیر کے ساتھ یہی کچھ کہا۔ اُس کے نزدیک زندگی کی یہ ساری کشمکش اور پیکار در حقیقت روح مطلق ہی کے مظاہر ہیں۔ انسان اس ساری کشمکش میں محض ایک آلۂ کار کی حیثیت سے کام کرتا ہے اس کے عزائم، اس کی ضروریات، اس کے افکار غرضیکہ اُس کی پوری زندگی کی تشکیل اور صورت بندی روح مطلق خود اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے کرتی ہے۔ انسان اس زعم میں مبتلا ہے کہ وہ آزاد ہے اور جو کچھ کر رہا ہے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے کر رہا ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ انسان کی زندگی روح عالم (World spirit) کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے محض ایک کٹھ پتلی جسے وہ جدھر چاہتی ہے گھما دیتی ہے۔ نہ اس کے افکار اپنے ہیں نہ نظریات و مقاصد اپنے۔

یہی حال مارکس کا ہے۔ وہ انسان کو بندۂ مجبور سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان حالات کی پیداوار ہے اور ان حالات کے بنانے میں اصل اور فیصلہ کن قوت معاشی ہے۔ انسان خصلتاً طور پر معاشی محرکات کے اشاروں پر چل رہا ہے۔ یہ محرکات جس رخ پر چاہیں اُسے لے جاتے ہیں۔ جس سانچے میں چاہیں اُسے ڈھال دیتے ہیں اور جن مقاصد کے لیے چاہیں اُسے استعمال کرتے ہیں۔ وہ خود کچھ بھی نہیں ہے — اسلام انسان کے متعلق اس نظریہ کا سخت مخالف ہے۔ وہ انسان کو خدا کا نائب اور خلیفہ سمجھتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ	اور جس وقت آپ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں ایک نائب بناؤں گا تو فرشتے کہنے لگے کہ کیا آپ اس زمین میں ایسے لوگوں کو مقرر کریں گے جو یہاں فساد اور خونریزی کریں گے، حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح و تیری تقدیس

قَالَ اِنِّىٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ (۲ : ۳۰)

کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝

اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک کالے سڑے ہوئے سوکھے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے لیے سربسجود گر جانا۔

اس مضمون کو قرآن پاک میں مختلف طریقوں سے متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا نائب بنایا۔ اس کو فرشتوں سے بڑھ کر علم عطا کیا۔ اور اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی، فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے اس نائب کو سجدہ کرو۔ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا اور اس طرح ملکوتیت اس کے آگے جھک گئی مگر ابلیس نے انکار کیا اور اس طرح شیطانی قوتیں انسان کے آگے نہ جھکیں۔ حقیقت میں تو وہ مٹی کا ایک حقیر سا پتلا تھا مگر خدا نے اس میں جو روح پھونکی تھی اور اس کو جو علم بخشا تھا اس نے اسے نیابتِ خداوندی کا اہل بنا دیا۔

یہ ہے وہ مقام جہاں اسلام اور مغربی فلسفہ کی راہیں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہیں۔ مغربی فلسفہ کی رُو سے انسان ایک حیوانِ ناطق ہے۔ مگر اسلام میں وہ نائب خدا ہے۔ خالق کائنات نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ صرف اسی کی ذات کے لیے ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۔ (۱۷ : ۷)

ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ (۲۲ : ۶)

اے انسان کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے ان چیزوں کو جو زمین میں ہیں تمہارے لیے مطیع بنا دیا۔

"اور جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمہارے لیے سردی سے حفاظت کا سامان ہے۔ اور منفعتیں ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ ان میں تمہارے لیے ایک شان جمال ہے۔ جب کہ صبح تم ان کو لے جاتے ہو اور شام واپس لاتے ہو وہ تمہارے بوجھ ڈھو کر اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں تک تم بغیر جانکاہی کے نہیں پہنچ سکتے۔ تمہارا رب بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ گھوڑے اور خچر اور گدھے تمہاری سواری کے لیے ہیں اور سامانِ زینت ہیں۔ خدا اور بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے . . . .

وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، اس میں سے کچھ تمہارے پینے کے لیے ہے اور کچھ درختوں کی پرورش کے کام آتا ہے۔ جن سے تم اپنے جانوروں کا چارہ حاصل کرتے ہو۔ اس پانی سے خدا تمہارے لیے کھیتی اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے پھل اگاتا ہے، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اسی نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند اور تارے مسخر کیے ہیں۔ یہ سب اسی خدا کے حکم سے مسخر ہیں، ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں، اور بہت سی وہ مختلف الالوان چیزیں جو اس نے زمین میں تمہارے لیے پیدا کی ہیں، ان میں سبق حاصل کرنے والوں کے لیے بڑی نشانی ہے اور وہ خدا ہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کیا کہ اس سے تم تازہ گوشت (مچھلی نکال کر) کھاؤ اور زینت کا سامان (موتی وغیرہ) جن کو تم پہنتے ہو۔ اور تو دیکھتا ہے کہ کشتیاں پانی کو چیرتی ہوئی سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں چنانچہ سمندر کو اس لیے بھی مسخر کیا ہے کہ تم لوگ اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی تجارت کرو) شاید کہ تم شکر بجا لاؤ، اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ جائے اور دریا اور راستے بنا دیئے کہ تم منزلِ مقصود کی راہ پاؤ، اور بہت سی علامات بنائیں منجملہ ان کے تارے بھی ہیں جن سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں . . . اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان کو بے حساب پاؤ گے۔ (۱۶ : ۱-۲)

ان آیات میں انسان کو بتایا گیا ہے کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب تیری خدمت اور

فائدے کے لیے مسخر کی گئی ہیں اور آسمان کی بھی بہت سی چیزوں کا یہی حال ہے۔ یہ درخت، یہ سورج، یہ ستارے غرض یہ سب چیزیں جنہیں تو دیکھ رہا ہے تیری خادم ہیں تیری منفعت کے لیے ہیں اور تیرے لیے ان کو کارآمد بنایا گیا ہے تو ان سب پر فضیلت رکھتا ہے۔ لہٰذا تو اپنے ان خدام سے کام لے مگر ایک غیر ذمہ دار اور غیر مسئول حاکم کی طرح نہیں بلکہ نیابت کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے۔ تیری نیابت جہاں تجھ کو فضیلت عطا کرتی ہے وہاں تم پر بہت سی ذمہ داریاں بھی ڈالتی ہے، جن سے اچھی طرح عہدہ برا ہو کر ہی تو نیابت کا صحیح معنوں میں مستحق ہو سکتا ہے۔ بحیثیت نائب کے تیرا یہ فرض ہے کہ تو جس کا نائب ہے اس کی اطاعت کرے، اگر تو ایسا نہیں کرتا ہے تو تُو باغی ہے اور اس کا مجاز نہیں ہے کہ اپنے آقا کی رعیت اور اس کے نوکروں اور خادموں اور غلاموں کو خود اپنی رعیت اپنا نوکر، اپنا خادم اور اپنا غلام بنا لے، اگر تو ایسا کرے گا تب بھی تو باغی قرار دیا جائے گا اور دونوں حالتوں میں سزا کا مستحق ہوگا۔ تجھ کو جس جگہ نائب بنایا گیا ہے وہاں تو اپنے آقا کی املاک میں تصرف کر سکتا ہے، ان سے خدمت لے سکتا ہے، ان کی نگرانی کر سکتا ہے مگر اس حیثیت سے نہیں کہ تو خود آقا ہے اور نہ اس حیثیت سے کہ اس آقا کے سوا تو کسی اور کا ماتحت ہے بلکہ صرف اس حیثیت سے کہ تو اپنے آقا کا نائب ہے اور جتنی چیزیں اس کے زیر حکم ہیں ان پر اپنے آقا کا امین ہے۔ اس بنا پر تو سچا اور پسندیدہ اور مستحقِ انعام نائب اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اپنے آقا کی امانت میں خیانت نہ کرے اس کی ہدایت پر عمل کرے، اس کے احکام سے سرتابی نہ کرے، اس کی املاک اس کی رعیت اس کے نوکروں، اس کے خادموں اور اس کے غلاموں پر حکومت کرے، ان سے خدمت لینے، ان میں تصرف کرنے اور ان کی نگرانی کرنے میں اس کے بنائے ہوئے قوانین پر کاربند ہو۔ اگر تو ایسا نہ کرے گا تو نائب نہیں باغی ہوگا، پسندیدہ نہیں مردود ہوگا، مستحقِ انعام نہیں مستوجب سزا ہوگا۔"

اس ضمن میں ایک اور ضروری بات جو توجہ کے قابل ہے وہ یہ کہ اسلام کی تعلیم کے مطابق کوئی مخصوص فرد یا گروہ نائبِ خدا نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کو یہ فضیلت عطا کی گئی ہے اور دنیا کا ہر فرد خلیفۂ خدا ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسانوں کے برابر ہے۔ ایک انسان، دوسرے

انسان سے جس چیز کا مطالبہ کر سکتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ وہ آقا کے حکم اور اس کی ہدایت کی پیروی کرے اس معاملہ میں پیروی کرنے والا، اطاعت کیش اور پیروی نہ کرنے والا باغی اور سرکش ہے۔ کیونکہ جو نیابت کا حق ادا کرتا ہے وہ حق نیابت نہ ادا کرنے والے سے بہتر ہے مگر فضیلت کے یہ معنی نہیں کہ وہ خود اس کا آقا ہے۔

دوسرے نیابت اور امانت کا منصب ہر انسان کو شخصاً شخصاً حاصل ہے۔ اس میں کوئی مشترک ذمہ داری نہیں۔ اس لیے ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس منصب کی ذمہ داریوں کے بارے میں جواب دہ ہے۔ یہاں ہر شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانا ہے۔ اس معاملہ میں نہ زید کے عمل کی ذمہ داری بکر پر عائد ہوتی ہے اور نہ ایک کو دوسرے کے عمل کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ نہ کوئی کسی کو اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر سکتا ہے اور نہ کسی کی غلط روی کا وبال دوسرے پر پڑ سکتا ہے۔ قرآن پاک میں مختلف مقامات پر اس امر کی وضاحت کی گئی ہے۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ اور لہا کسبت وعلیہا ما اکتسبت کہہ کر ہر فرد بشر کو کلیۃً اس کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے، اگر کوئی شخص پاک بازی کی زندگی بسر کرتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا (ومن تزکّٰی فانما یتزکّٰی لنفسہٖ) اگر کوئی محنت اور مشقت کرے گا تو اس کا فائدہ بھی خود اسی کو حاصل ہوگا (ومَنْ جَاھَدَ فَاِنَّمَا یُجَاھِدُ لِنَفْسِہٖ) اور اگر کوئی نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس میں اس کی اپنی ہی فلاح ہے۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَھَا، جس کسی نے اپنی زندگی میں ذرہ بھر بھلائی کی تو وہ اس کا پھل پائے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی تو وہ بھی اس کا نتیجہ دیکھ لے گا (فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ)

یہ ذمہ داری کا منصب ظاہر بات ہے کہ کسی بندۂ مجبور کو نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ایک فرد اس فرض کی بجا آوری کے لیے مجبور ہی ہے تو اس میں انسانیت کا کمال کیا ہے۔ اس بارِ امانت کے حامل اور اس خلیفۃ اللہ فی الارض کی امتیازی خصوصیت جس کی بنا پر یہ دوسری مخلوقات سے ممتاز ہو گیا ہے یہ ہے کہ اسے طبعاً اطاعت کیش نہیں بنایا گیا بلکہ اسے عمل کی قوت عطا کر دی گئی ہے جس سے

کام لے کر وہ غلط راستہ پر بھی جا سکتا ہے اور صحیح پر بھی ـــــــــــــ۔ خداوند تعالیٰ کے نظام کلی کے تحت قوانین و حدود الٰہیہ کا پابند ہونے کے باوجود وہ ایک خاص دائرہ میں مجبورانہ اطاعت سے آزاد ہے اور اتنا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے اطاعت کرے اور چاہے سرکشی و نافرمانی کرنے لگے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ
يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ
يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ
مُّهِيْنٌ ۝ (النساء ۔ ۲)

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کر دیگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی جن میں وہ ہمیشہ رہیگا یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور رسول کی نافرمانی کریگا اور اسکی حدود سے تجاوز کرے گا اُسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔

یہ اور ایسی ہی بیشمار آیات ظاہر کرتی ہیں کہ انسان میں بخلاف دوسری مخلوق کے ایک ایسی قوت موجود ہے جس سے وہ اطاعت اور سرکشی دونوں پر قدرت رکھتا ہے اور اس قوت کے صحیح یا غلط استعمال سے وہ فوز یا خسران، ثواب یا عقاب انعام یا غضب کا مستحق ہوتا ہے۔

اگر انسان سے یہ آزادی عمل سلب کر لی جائے تو اخلاق کا سارا فلسفہ بالکل بیکار ہو جاتا ہے پھر اس میں اور ایک مشین میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا اور انسان کی پوری مذہبی اور اخلاقی زندگی ایک کھیل تماشہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ قرآن پاک کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ خالق کائنات جس نے ہمیں اس دنیا میں پیدا کیا ہے، ہمیں علم دیا ہے، غور و فکر اور ارادے اور فیصلے کی قوتیں عطا کی ہیں۔ جس نے ہمیں نیک و بد میں تمیز کرنے کا احساس بخشا ہے۔ اُس نے یہ سب کچھ ہمارے ساتھ مذاق کے طور پر نہیں کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس کارساز نے ہمیں بھلائی اور برائی کے درمیان فرق کرنا سکھایا ہے اُس نے ہمیں محدود پیمانہ پر کچھ اختیارات بھی دے رکھے ہیں اور ان اختیارات کے استعمال میں ہمیں مناسب حد تک آزادی بھی دی گئی ہے اور پھر اس کے بعد ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ ہم از خود جادۂ مستقیم پر گامزن ہوں۔ چنانچہ اس دور کے ایک بڑے مفکر ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنی کتاب

اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل" میں فرمایا ہے :-

"جنت میں آدم کی زندگی دراصل انسانیت کے اس ابتدائی دور سے عبارت ہے جب کہ اس میں احساس خودی پیدا نہ ہوا تھا اور اس نے اپنے ارادے اور علم کی قوت سے ماحول سے مطابقت کرنا نہیں سیکھا تھا۔ اس کا دل آرزو اور احتیاج کی خلش سے بیگانہ تھا۔ یہ واقعہ (یعنی آدم کا جنت سے نکلنا) دراصل اس حقیقت کی یادگار ہے کہ کس طرح انسان نے اپنے جبلی میلانات کے دائرہ سے باہر قدم نکالا اور ایک آزادانہ اور با اختیار ایغو کا مالک بنا۔ اس میں آگہی، وقوف، شک اور خلاف ورزی کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ آغوشِ فطرت میں طویل خواب کے بعد اب وہ بیدار ہوا اور اس کو پہلی دفعہ یہ محسوس ہوا کہ واقعات و حوادث کے اسباب اُس کی ذات میں پنہاں ہیں۔ آدم کی نافرمانی اُس کے لیے ایک سبق تھی۔ اس طرح اُس نے اپنے اختیار و ارادہ کو برتنا سیکھا۔ اسی لیے اس کا قصور معاف کر دیا گیا۔" (روحِ اقبال از یوسف حسین خاں)

یہ ارادہ و اختیار جس طرح ایک فرد کو ملا ہے اسی طرح قوموں کے حصہ میں بھی آیا ہے۔ قومیں اور جماعتیں بے جان مادے کے برعکس، جو سابقہ علتوں کے اثرات کو خود بدل نہیں سکتا، اپنے طرزِ عمل کو تبدیل کر کے دنیا میں کامیاب و کامران ہو سکتی ہیں۔ افراد کی طرح قومیں اور جماعتیں کے حالات قانونِ علت و معلول کی جکڑ بندیوں سے کافی حد تک آزاد رہتے ہیں۔ اس بارے میں قرآنِ پاک نے بڑی صراحت سے فرمایا ہے :-

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۔	اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ اس کے افراد اپنے آپ کو نہ بدلیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اگر کوئی قوم اپنی تقدیر کو بدلنے کا ارادہ کرے تو اسے ایسا کرنے پر اختیار ہے۔ خداوند تعالیٰ اُس کی اس معاملہ میں معاونت فرماتے ہیں۔

اس کے علاوہ اسلام انسان کے پیدائشی گناہ گار ہونے کے تصور کو باطل سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک جنت سے نکلا ہوا انسان پیدائشی مجرم نہیں ہے۔ افرادِ انسانی کو فطرۃ اللہ پر مخلوق قرار دیتا ہے۔"

اور ان کے ذہنی اور بدنی خوبی کے متعلق یہ تصور رکھتا ہے کہ وہ اگرچہ بھلائی اور برائی کے دوگونہ رجحانات کے زیر اثر آسکتے ہیں لیکن وہ فی الجملہ انسان کو خیر کی طرف زیادہ آسانی سے مائل کرنے والا تسلیم کرتا ہے۔ انسان کی فطرت سے اسے کوئی مایوسی نہیں۔

یہی وہ فرق ہے جو اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ مسیحی تصور کے مطابق دنیا سرتاپا گناہ ہے۔ خواہشات نفسانی اور احساس خودی دراصل آدم کی اس لغزش کا نتیجہ سمجھے جاتے ہیں جس کی وجہ سے اسے جنت سے نکالا گیا۔ اسی بنا پر عیسائیوں کے ہاں اس خیال کا عام چرچا رہا ہے کہ اگرچہ اس کائنات کا خالق خداوند تعالیٰ ہی ہے مگر اس کو تخلیق کرنے کے بعد اس کے نظم ونسق کو چلانے کی غرض سے اسے شیطان کے حوالے کر دیا گیا تاکہ جس طرح چاہے وہ اس سرزمین میں فسق و فجور پھیلاتا پھرے اور اس معاملہ میں اس کی راہ میں کوئی چیز مزاحم نہ ہو۔ اس تعلیم کی رو سے انسان فطرۃً ذلیل وحقیر ہے اور اس وجہ سے وہ کسی ذمہ داری کا اہل نہیں ہو سکتا۔ آدم کے جنت سے نکلنے اور دنیا میں آنے کے متعلق مسیحی اور اسلامی تعلیمات میں جو فرق ہے وہ دراصل زندگی کے اس نقطہ نظر پر مبنی ہے جو ان مذہبوں نے اپنے پیروؤں کے لیے پیش کیا۔

قریب قریب یہی یا اس سے کچھ بڑھ کر حال بدھ مت اور ہندو مت کا ہے۔ ان دونوں نے بھی زندگی کی خواہشات کو کچلنے اور اپنے وجود کے فنا کرنے میں انسانی عظمت کا راز سمجھا ہے۔ اس کے برعکس قرآن نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے مطابق انسان کی سعادت و فلاح صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ وہ تمام صلاحیتوں کو کام میں لاکر اپنی خودی کو ہدایت الٰہی کے مطابق مستحکم کرے۔ اسلام جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے انفرادی ذمہ داری اور سعی وعمل کو زندگی کا اصل الاصول قرار دیتا ہے جس سے اس کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کو اجاگر کرنا مقصود ہے۔ اگر وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوتا ہے، اگر وہ فسق وفجور کی راہ اختیار کرتا ہے تو یہ کسی قدرتی دباؤ کے تحت نہیں اور نہ وہ پیدائشی گناہگار ہونے کی وجہ سے ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ قرآن کی رو سے وہ نیکی پہ پیدا کیا گیا ہے۔ اب اگر وہ فضیلت کے اعلیٰ معیار سے گرتا ہے اور اس مقام محمود کو چھوڑتا ہے جو خالق کائنات نے اسے

بخشاہے تو یہ اس کی اپنی ہی سیہ کاریوں کا نتیجہ ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝

ہم نے بنایا آدمی کو بہترین اندازہ پر۔ پھر ہم اُسے پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں۔ مگر جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے سو اُن کے لیے بے انتہا اجر ہے۔

قرآن حکیم اس دنیا کو دار العذاب نہیں سمجھتا بلکہ اسے آزمائش گاہ خیال کرتا ہے جس میں آکر انسان کو اپنی صلاحیتوں کے ابھارنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہو جائے تو پھر اس کے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے اور اگر وہ اس میں ناکام ہوتا ہے تو دنیا اور آخرت دونوں میں اُسے رسوا ہونا پڑتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اُسے نیابت عطا کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ ط (۶: ۲۰)

وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض سے اونچے درجے دیئے تاکہ جو کچھ اس نے تم کو دیا ہے اُس میں تمہاری آزمائش کرے۔

قَالَ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَیَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (۷: ۱۴)

(موسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا) قریب ہے کہ خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں زمین کی خلافت دے تاکہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ط اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا

اے داؤد! ہم نے تجھ کو زمین میں اپنا نائب بنایا ہے پس تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور اپنی خواہشات کی پیروی نہ کر یہ تجھے اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیگی۔ جو لوگ

یوم الحساب (۳۸ : ۲) اللہ کے راستے سے بھٹک چکے ہیں ان کے لیے اس بنا پر عذاب ہے کہ وہ حساب کے دن کو بھول چکے ہیں۔

یہ آیات اس حقیقت کی ترجمان ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ہمیں اپنی خلافت سے اس لیے نوازا ہے کہ ہم اس آزمائش میں پورے اتریں۔ ظاہر بات ہے کہ جب خدا نے ہمیں اس امتحان گاہ میں اتارا ہے تو اس نے ہماری کامیابی اور ناکامی کا ایک معیار بھی ضرور رکھا ہے جس پر جانچ کر وہ بعض کو کامیاب اور بعض کو ناکام کرتا ہے۔ اس کی مشیت کوئی اندھی بہری قوت نہیں جس کا کوئی اصول اور ضابطہ ہی نہ ہو۔ وہ جب کسی قوم کو دنیا میں سربلند کرتا ہے تو اس میں ایسی خوبیاں ضرور پائی جاتی ہیں جو اسے اس کا مستحق ٹھہراتی ہیں۔ اور جب کسی قوم کو پستی کی طرف دھکیلتا ہے تو اس میں ایسی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اسے عروج کے مقام پر رہنے کے قابل نہیں چھوڑتیں۔ خداوند تعالیٰ از خود کسی قوم سے اپنی عطا کردہ عنایات واپس نہیں لیتے۔ وہ اس وقت ان نوازشوں کو چھینتے ہیں جب قوم اپنی بدکرداری سے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ وہ ان کی اہل نہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔

اللہ تعالیٰ کسی قوم سے اپنی عطا کردہ نعمتیں واپس نہیں لیتا جب تک کہ وہ قوم اپنے عمل اور کردار سے خود نہیں بدلتی۔

آیئے اب ہم ایک نظر انسان پر بھی ڈال لیں۔

اس کی ہستی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ اپنے اندر دو مختلف حیثیتیں رکھتا ہے۔ جو اپنی اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں مگر باہم دگر ملی جلی بھی۔

ایک حیثیت سے وہ ایک حیوان ہے اور اسی وجہ سے اس پر وہی قوانین فرمانروائی کرتے ہیں جو تمام طبیعات وحیوانات پر نافذ ہوتے ہیں۔ اس لیے انسان کے وجود کی کارکردگی منحصر ہے ان آلات و وسائل پر، ان مادی ذرائع پر، اور ان طبعی حالات پر جن پر دوسری تمام طبعی اور حیوانی موجودات کی کارکردگی کا انحصار ہے۔ یہ پیکر انسانی جو کچھ کر سکتا ہے انہیں قوانین طبعی کی

پابندی کے ذریعہ، آلات و وسائل کی مدد سے اور طبعی حالات کے اندر ہی رہتے ہوئے کر سکتا ہے اور اس کے کام پر عالم اسباب کی تمام قوتیں مخالف یا موافق اثر ڈالتی ہیں۔

اُس کی دوسری حیثیت جس کی وجہ سے اُسے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے، اُسکی حیوانی حیثیت نہیں بلکہ اُس کی اخلاقی حیثیت ہے اور اس حیثیت سے وہ طبیعات کا تابع نہیں بلکہ اُن پر ایک طرح سے حکومت کرتا ہے اور اپنے طبعی و حیوانی وجود کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

انسان کے اندر ان دونوں قوتوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ ایک طرف اُس کے حیوانی داعیات ہیں، اور دوسری طرف اخلاقی احساسات۔ مجموعی حیثیت سے اُس کی کامیابی کا راز مادّی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے۔ اُسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کی مدد سے، اور اگر وہ گرتا ہے تو اُسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اُس کے ہاتھ سے چھن جاتی ہیں یا اس میں وہ دوسروں کی بہ نسبت کمزور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر حالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ قوموں کے عروج و زوال میں اصل اور فیصلہ کن قوت صرف اخلاقی قوت ہے۔ باقی رہتے مادّی وسائل اور اسباب، تو اُن کی حیثیت آلۂ کار کی سی ہے۔ انسانی عظمت صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہ چند دھاتوں کا مجموعہ ہے، یا اُس میں چلنے پھرنے کی قوتیں موجود ہیں بلکہ اُس کی وہ امتیازی خصوصیت جس کی وجہ سے اُسے خلیفہ منتخب کیا گیا ہے، اخلاقی ذمہ داری کا حامل ہونا ہے۔ لہٰذا جب انسانیت کا جوہر صرف اخلاق ہی ہے تو لامحالہ انسانیت کی ترقی اور تنزل میں اخلاقیات کو ہی انسانی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں فیصلہ کن مقام حاصل ہے۔ اس لیے اگر اسلامی فلسفۂ تاریخ کو تاریخ کی اخلاقی تعبیر کا نام دے دیا جائے تو یہ غیر موزوں نہ ہو گا۔

اس سلسلہ میں ہم ایک اور ضروری بات جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مغربی اقوام کی ہوش رُبا مادّی ترقی نے بعض ذہنوں کو یہاں تک متاثر کیا ہے کہ اُن کی نظر سے قانونِ طبعی (Physical law) اور قانونِ شرعی (Moral law) کا فرق یکسر اوجھل ہو گیا ہے۔

ا؎ سید ابوالاعلیٰ مودودی

ان کے نزدیک عبادتِ الٰہی محض قانونِ طبعی کی پیروی کا نام ہے قطع نظر اس کے کہ وہ قانونِ شرعی کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ اس بنا پر وہ ان لوگوں کو بھی خدا کے عبادت گزار بندے قرار دیتے ہیں جو قانونِ طبعی کو کام میں لاکر ایجادات و اکتشافات کے میدانوں میں دنیا کی دوسری اقوام سے آگے نکل جائیں۔ اگرچہ وہ ان کے استعمال میں خداوند تعالیٰ کے قانونِ اخلاق کے بالکل پابند نہ ہوں۔ اسی قسم کا ایک نظریہ ایک بزرگ نے یوں پیش کیا ہے:-

"آج دنیا میں وہی قوم بلندی، آزادی اور عزت حاصل کر سکتی ہے جو صحیح معنوں میں فیض رساں اور خادم خلق ہو۔ جو مخازن و معادن کو استعمال میں لاکر رفاہ عامہ کے لیے گاڑیاں چلائے، دریاؤں پر پل باندھے، نہروں اور سڑکوں کا جال پھیلائے، سمندر کی طغیانیاں مسخر کرکے انہیں تجارت کے قابل بنائے جن کی تلاش و جستجو سے ایک عالم فائدہ اٹھائے، جو آبشاروں سے بجلی پیدا کرکے دنیا کو روشنی اور طاقت عطا کرے جو کوئلے اور پٹرول کا صحیح استعمال جانتی ہو اور جس کے فولادی اسلحہ اعدائے انسانیت کے لیے تباہی و ہلاکت کا پیام ہوں۔"

اس کے بعد امر بالمعروف کی تشریح فرماتے ہوئے کہتے ہیں:-

"قرآن میں ہمیں آمر بالمعروف کا لقب دیا گیا ہے۔ معروف یہی ہے کہ ہم کائنات کے اسلحہ خانہ سے قوت و ہیبت کا وہ سامان پیدا کریں کہ شیطان کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو جائے۔"

قرآن پاک کی یہ تفسیر اس کی حقیقی روح کے یکسر منافی ہے۔ اس کے تو دنیا میں آنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ انسان کو یہ بتائے کہ وہ "اندر کے میدان" پر کس طرح غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ اگر قرآن حکیم کا مدعا صرف یہ ہے کہ وہ انسانوں کو ہوائی جہاز اور بم بنانے کی تلقین کرے تو اس لحاظ سے مغربی اقوام مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ مومن اور صالح ہیں۔ اسلامی تعلیمات کا ایسے گمراہ کن نظریات سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اگر انسان کو محض قانونِ طبعی کی پیروی کے لیے پیدا کیا جاتا تو پھر کسی نبی اور کسی کتاب کی ضرورت نہ تھی، اس کے لیے صرف حیواناتی جبلت ہی کافی تھی جو سارے زندگی میں اس کی رہنمائی کرتی۔ جس طرح ایک بھیڑیے کا بکریوں کو کھا جانا عین قانونِ طبعی کی پیروی ہے اسی طرح ظالم

اقوام یا جماعتوں کا کمزوروں پر ظلم وستم ڈھانا بھی عین فطرت ہے۔ اس بنا پر ہر قسم کا جور وجفا اور لوٹ کھسوٹ نہ صرف جائز ہے بلکہ عین انصاف ہے۔ اس نظریہ کو تسلیم کر لینے کے بعد انسان اور موذی جانوروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا انسانیت نے آج تک جو لڑائی حق اور انصاف کے لیے لڑی ہے وہ سب بیکار اور غلط ہے۔ اسلام اس فلسفہ کی پورے زور سے تردید کرتا ہے۔ اس کی تو بنیادی تعلیم ہی یہی ہے کہ انسان کی طبعی زندگی کو قانون شرعی کے مطابق ڈھالا جائے اور اسے اخلاق کی ان معروضی قدروں (Objective Values) کا پابند بنایا جائے جو خدا تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ سے اہل دنیا تک پہنچائیں۔

پھر اس نظریہ کے حامی ایک ضروری بات جو بھول جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر عروج نام ہی مادی غلبہ کا ہے اور زوال مادی اسباب کی کمی ہے تو اس لحاظ سے یہ کہنا کہ مادی طاقت عروج کا باعث ہوتی ہے یکسر غلط ہے۔ اس میں ایک فکری تضاد پایا جاتا ہے۔ اس دعویٰ کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ کسی قوم کا مادی غلبہ اس کے مادی غلبہ ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ استدلال نہایت ہی مہمل اور بے معنی ہے۔

بالفرض اگر چند لمحوں کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کسی قوم کی ترقی کرتے رہنے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ مادی اعتبار سے مضبوط ہو اور اس کے ذلیل وخوار رہنے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ بے سروسامان ہو تو پھر آج تک کی ساری تاریخ غلط ہو جاتی ہے۔ اس اصول کے مطابق اگر ایک قوم کو دنیا میں ترقی حاصل ہو جائے تو پھر اسے اسی مقام پر رہنا چاہیے کیونکہ اس مادی طاقت کی وجہ سے وہ مزید دولت سمیٹ سکتی ہے اور دوسری قوموں کو ہمیشہ کے لیے مغلوب رکھ سکتی ہے لیکن تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔ ایک قوم یکایک گمنامی سے نکل کر میدانِ عمل میں آتی ہے۔ طاقت اور ثروت کو غلام بنا کر دنیا پر چھا جاتی ہے۔ پھر یکایک کارزارِ حیات میں وہ پسپا ہونا شروع ہوتی ہے، اس کی طاقت کم ہو جاتی ہے، اس کی دھاک دلوں سے اٹھنے لگتی ہے اور تاریخ کے وہی اوراق جنہوں نے کبھی اس کا خیر مقدم کیا تھا وہ اس کے

مدفن بھی بنتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آخروہ کونسی طاقت ایسی ہے جو ایک قوم کو مادّی وسائل کے صحیح طور پر استعمال کرنے پر اُبھارتی ہے اور جس کے ختم ہوتے ہی یہی مادّی اسباب اس کے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ یہ قوت اخلاق کی قوت ہے۔ اس بات کو جسم اور روح پر قیاس کر لیجیے۔ قوموں کی زندگی میں مال و اسباب جسم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اخلاقی قوت بمنزلہ روح کے ہوتی ہے۔ کوئی صاحب عقل جسم کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر اصل چیز جو اس جسم کو جان عطا کر کے اسے سرگرمِ عمل کرتی ہے وہ انسان کی روح ہے۔ روح کا جسم سے رشتہ منقطع ہوتے ہی جسم بیکار ہو جاتا ہے اور کچھ وقت گزرنے کے بعد اس سے بدبو آنے لگتی ہے۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ ان کی زندگی میں مادّی ذرائع اور وسائل کافی اہمیت رکھتے ہیں مگر ان کی حیثیت بہرحال ذرائع ہی کی۔ اصل قوت جو ان ذرائع کو استعمال میں لاتی ہے وہ اخلاقی قوت ہے اور اگر یہ قوت ناپید ہو تو یہی مادّی اسباب اکثر اوقات اُس کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔

اخلاق کی اس قوت کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک بنیادی انسانی اخلاقیات اور دوسرے اسلامی اخلاقیات۔ بنیادی انسانی اخلاق سے ہماری مراد وہ اوصاف ہیں جن پر انسان کے اخلاقی وجود کی اساس قائم ہے اور اُن میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو دنیا میں انسان کی کامیابی کے لیے بہرحال شرطِ لازم ہیں۔ خواہ وہ صحیح مقصد کے لیے کام کر رہا ہو یا غلط مقصد کے لیے۔ ان اخلاقیات میں اس امر کی کوئی تخصیص نہیں کہ افراد یا قومیں خداوند تعالیٰ کو مانتی ہیں یا نہیں، اُن کا آخرت پر ایمان ہے یا نہیں، وہ وحی پر یقین رکھتی ہیں یا نہیں۔ اگر وہ ان اخلاقیات کو اپناتی ہیں تو وہ زندگی کی اس تگ و دو میں بہرحال کامیاب ہونگی۔ یہاں اس بات کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کے عزائم اچھے ہیں یا بُرے، اُن کے ہاں طہارتِ نفس اور نیت خیر کی متاع ہے یا نہیں۔ جو شخص اور جو گروہ بھی اپنے اندر ان اوصاف کو پیدا کریگا وہ دنیا میں یقیناً کامیاب ہوگا اور اُن لوگوں سے بازی لے جائے گا جو ان اوصاف کے لحاظ سے اس کے مقابلہ میں ناقص ہونگے۔

"اسلامی اخلاقیات بنیادی انسانی اخلاقیات سے کوئی الگ چیز نہیں بلکہ اسی کی تصحیح اور تکمیل ہے۔ اسلام کا پہلا کام یہی ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو ایک صحیح مرکز اور محور مہیا کر دیتا ہے جس سے وابستہ ہو کر وہ سراپا خیر بن جاتے ہیں۔ اپنی ابتدائی صورت میں تو یہ اخلاقیات مجرد ایک قوت ہیں جو خیر بھی ہو سکتی ہیں اور شر بھی ۔ ۔ ۔ ان کا کسی شخص یا گروہ میں ہونا بجائے خود خیر نہیں بلکہ اس کا خیر ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ یہ قوت صحیح راہ میں صرف ہو اور اس کو صحیح راہ پر لگانے کی خدمت صرف اسلام ہی انجام دے سکتا ہے۔"[1] لہٰذا ایک فرد یا گروہ کی حقیقی سربلندی تو یہی ہے کہ وہ دینِ حق کا پورے شعور کے ساتھ پیرو ہو۔ وہ سوچ سمجھ کر ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر ایمان لائے اور اُس پر عمل بھی کرے۔ اس لیے جب ہم بنیادی انسانی اخلاقیات کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان سے ہمارا مقصد صرف اُن قدروں کا تعین ہے جو صرف اس دنیا میں انسان کو سربلندی عطا کرتی ہیں۔ باقی رہی آخرت کی نجات تو وہ صرف قبولِ اسلام ہی میں ہے۔

یہ انسانی اخلاقیات دراصل وہ عالمگیر حقیقتیں ہیں جن کو سب انسان جانتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی چیزیں نہیں کہ انہیں کہیں سے ڈھونڈ کر نکالنے کی ضرورت ہو۔ وہ انسانیت کی جانی پہچانی متاع ہے جس کا شعور اُس کی فطرت میں شروع سے ہی ودیعت کر دیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کسی قوم کے چند نفوس کا ان اخلاقی بنیادی صفات کو اپنا لینا اُس کو ترقی کی راہ پر نہیں لے جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے زیادہ سے زیادہ افراد میں یہ صفات پائی جائیں۔ یوں تو دنیا کی شاید ہی کوئی قوم ایسی ہو گی جس کے چند افراد میں بھی یہ صفات نہ ملتی ہوں مگر عظمت اور سربلندی صرف اُس کو نصیب ہوتی ہے جس کی عظیم اکثریت ان سے متصف ہو۔ آئیے اب ہم اُن صفات کا جائزہ لیں جن کو جب کوئی قوم اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے تو کامیاب ہو جاتی ہے۔

قومی عروج و ترقی اور اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مقصد کا

---

[1] ماخوذ از تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں

شعور اور نصب العین کا عشق ہی وہ اصلی قوت ہے جو اقوام کو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد، مقصد کی مقناطیسی کشش ہی اس کی جدوجہد کا اصلی محرک ہے۔ مقصد سے وابستگی زندگی ہے اور اس سے بے رغبتی موت۔ نصب العین کا عشق ہی ایک ایسا عشق ہے جو جماعتوں اور افراد کی خفتہ قوتوں کو بیدار کرتا ہے، اُن کے مختلف اجزا کو باہم جوڑتا ہے اور پھر اُن میں ترتیب اور تنظیم پیدا کرتا ہے۔ آپ جہاں بھی دیکھیں گے یہی پائیں گے کہ مقصد اور نصب العین کی محبت نے ہی اقوام و ملل کو سرگرم عمل کیا۔ دنیا میں آج تک کوئی قوم ایسی دیکھنے میں نہیں آئی جو زندہ بھی ہو اور نصب العین کی محبت سے خالی ہو۔ جس قوم کے افراد اس صفت سے خالی ہونگے اُن کا ترقی کرنا تو ایک طرف زندہ رہنا بھی محال ہے۔ جس جماعت کے ہاں کسی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی تڑپ نہ ہو، انہیں دوسرے لوگ بڑی ہی آسانی سے اپنی اغراض و مفادات کا تابع بنا لیتے ہیں۔ حیاتِ قومی کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ ایک قوم اُن اصولوں کی خاطر جنہیں وہ اپنا سمجھتی ہے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہ کرے۔ اور یہ جذبۂ ایثار اُسی نسبت سے بڑھتا ہے جس نسبت سے نصب العین کے ساتھ اسکے عشق میں ترقی ہوتی ہے۔ پھر اُس قوم کی تمام کوششیں ایک قطب نما سوئی کی طرح نہایت ہی فطری انداز میں اُسی ایک مقصد کے گرد گردش کرنے لگتی ہیں۔ دو رنگی اور تذبذب انفرادی زندگی میں بھی مہلک امراض ہیں مگر اجتماعی زندگی میں ان کی تباہ کاریاں بالکل ناقابلِ بیان ہیں۔ زندہ قومیں کسی آئیڈیل کو اپنانے پر اس کی روح کو اپنے پورے جسم میں متحرک کر لیتی ہیں پھر اُن کی زندگی کا کوئی مخفی سے مخفی گوشہ، قلب و دماغ کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ ریشہ بھی ایسا نہیں رہتا جو اس کے اثر سے محفوظ ہو۔ اس کے برعکس ایک دم توڑتی ہوئی قوم کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے نصب العین کے لیے زندہ رہنے کا سبق بھول جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کے لیے کسی مدلل گردانی کی ضرورت نہیں۔ دورِ جدید کی مغربی اقوام نے چند خلافِ فطرت اور خلافِ عقل مقاصد کو اپنا کر دنیا میں ترقی حاصل کی۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ اگرچہ ان کے مقاصد باطل ہیں مگر اُن کی طلب صادق ہے اور اُن کے عزائم راسخ۔ وہ زندگی کے تمام مسائل کو

اپنے نصب العین کی روشنی میں دیکھتی ہیں اور پھر اسی کے مطابق ہی انہیں حل کرتی ہیں۔

نصب العین سے محبت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قوم میں قوتِ عمل بڑھتی ہے، اس میں زندگی کے بھید کھلنا شروع ہونے ہیں۔ ذہن اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کرکے جسم کو ارادہ اور احساس کے سہارے آگے بڑھائے جاتا ہے اور نئے نئے تجربوں سے زندگی میں توسیع و استحکام پیدا کرتا ہے۔ قومیں اپنی تعمیر پیہم عمل سے ہی کرتی ہیں۔ اور یہ عمل ہی کا کرشمہ ہے کہ قوم کے اندر ارادے کی طاقت اور فیصلے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ عزم اور حوصلے سے، صبر سے اور استقلال سے حکمت اور شجاعت سے کام لینا سیکھتی ہے۔ پھر اس میں حزم و احتیاط اور معاملہ فہمی و تدبر ایسی بلند صفات ابھرتی ہیں نصب العین کا عشق اس کے افراد کو ذاتی اغراض و منافع کی پرستش سے بلند کر دیتا ہے اور ان میں یہ احساس زندہ کرتا ہے کہ ان کا شخصی مفاد دوسروں کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس احساس کا ناگزیر اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر شریفانہ خصائل ترقی کرتے ہیں۔ مثلاً خودداری، فیاضی، رحم، ہمدردی، انصاف، وسعتِ قلب و نظر، سچائی، امانت، راستبازی، پاسِ عہد، معقولیت، اعتدال، شائستگی، طہارت و نظافت اور ذہن و نفس کا انضباط۔ ان صفات پر اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری خوبیاں دراصل اُس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کوئی شخص اپنے نفس کو زیر کرکے دوسرے کے رنج و راحت کو اپنی ذاتی آسائش اور آرام پر ترجیح دینے لگتا ہے، اور محض تکلیفِ خویش کو بچانے کی فکر میں نہیں رہتا، بلکہ دوسرے کی دقتوں کو نکالنے کے لیے جدوجہد کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے۔ یہ سب خوبیاں کسی بلند نصب العین کا عشق ہی پیدا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے اچھے اور بُرے اعمال کو پانی اور جھاگ سے تعبیر کیا ہے۔ ایک تو نافع ہیں اور دوسرے ضائع ہونے والے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَۃٌ	اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے
بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا وَ	ظرف کے مطابق اُسے لے کر چل نکلا، پھر جب سیلاب
مِمَّا یُوْقِدُوْنَ عَلَیْهِ فِی النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْیَۃٍ اَوْ	اُٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آگئے اور ایسے ہی جھاگ

مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ (۱۳:۱۷)	اُن چیزوں پر بھی اُٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں۔ اس مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے جو جھاگ ہے وہ اُڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔

قرآن حکیم نے ان آیات میں کنایۃً یہ بتا دیا ہے کہ وہی قومیں دنیا میں باقی رہتی ہیں جن کے اعمال سے نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچے اور جن کا وجود نفع خلائق کا موجب ہو۔ ایسی اقوام وہی ہو سکتی ہیں جن کے دل میں انسانیت کا احترام دوسروں کی نسبت زیادہ ہو۔ جن کے دل کے تار اس قدر حساس ہوں کہ نوعِ انسانی کا معمولی دُکھ درد بھی اُن کے اندر ارتعاش پیدا کر دے۔ جن کے ہاں ایثار اور بے نفسی کی نعمت پائی جائے۔ جس قوم کے افراد ذاتی منفعت اور گھٹیا قسم کی خواہشات کے لیے جیتے ہوں اُن سے انسانیت کی فلاح و بہبود کی توقع رکھنا انتہائی غیر دانشمندی ہے۔ قرآن کا نظریۂ فضیلت ہمیں سکھاتا ہے کہ افراد و اقوام کا ایک دوسرے پر تفوق استحصال اور ظلم کے لیے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے تاکہ برتر اور فائق لوگ کمتر اور کمزوروں کی خدمت کریں اور اس طرح انہیں بھی اپنی سطح تک بلند کر لیں۔ ظالم اور عیش پرست افراد یا جماعتیں اپنے ذاتی عیش کی خاطر کمزوروں کو لوٹتی ہیں اور اس طرح انسانیت کی سطح بلند کرنے کی بجائے وہ اسے تنزل کی طرف لے جاتی ہیں۔ قدرت اُن کے وجود کو کچھ دیر کے لیے برداشت تو کرتی ہے تاکہ انہیں اصلاح کا موقع دے مگر جب وہ اپنی اس روش سے باز نہیں آتیں تو انہیں دنیا میں تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۔	ہم کسی آبادی (قوم) کو ہلاک نہیں کرتے بجز اس کے کہ اس کے افراد ظالم ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان قوموں کو دنیا کی کون کون سی چیزیں ظالم بناتی ہیں:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ	لوگوں کے لیے زینت رکھی گئی ہے، عورتوں، بیٹوں

اَلنِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ	اور چاندی سونے کے اکٹھے کیے ہوئے ڈھیر اور
الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ	اور نشان کیے ہوئے گھوڑوں، چوپایوں اور کھیتوں
الْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۔ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ	کی محبت میں۔ یہ تو دنیوی زندگی کی متاع ہے اور
الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۔	اللہ کے یہاں اس سے بہتر پناہ گاہ ہے۔

قرآن حکیم کے انداز بیان سے پتہ چلتا ہے کہ فساد کی اصل جڑ انسان کی یہ تملیکی ذہنیت (acquisitive mentality) ہے۔ جو اسے شہوت رانی، لذت طلبی، عیش پرستی، حصول دولت اور زینت و تفاخر کے اسباب جمع کرنے میں مشغول رکھتی ہے اور اس کے اندر احساس کو فنا کر دیتی ہے کہ وہ ابنائے نوع کے لیے بھی کوشش کرے۔ یہ خود غرضی مختلف شکلوں میں نمودار ہوتی ہے۔ مثلاً معاشی استحصال میں، بے حیائی اور بے غیرتی میں، اور کام و دہن کی لذت میں۔ یہ بیماری نہ صرف چند لوگوں کی ذہنیت اور اخلاق کو بگاڑتی ہے بلکہ قوم کے دیگر افراد بھی اس سے تباہ و برباد ہوتے ہیں۔ اور انحطاط کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ پوری قوم کے اندر "احساس زیاں" بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے مختلف اقوام کی تباہی کا ذکر جس طریقہ سے کیا ہے وہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ بربادی کا اصلی سبب "احساس کا فقدان" تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو ذلت و مسکنت اور غضب و لعنت الٰہی میں مبتلا اس وقت کیا گیا جب کہ ان کے ہاں اخلاقی پستی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ان کے بڑے بڑے نیک آدمی بھی امراء کے اعمال بد پہ گرفت نہ کرتے تھے۔

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ	تو ان میں سے اکثر کو دیکھتا ہے کہ گناہ اور حدود الٰہی
وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا	سے تجاوز اور حرام خوری کی طرف لپکتے ہیں۔ یہ کیسی بری
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ	حرکتیں تھیں جو وہ کرتے تھے۔ کیوں نہ ان کے مشائخ
وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ	اور علماء نے ان کو بری باتیں کہنے اور حرام کے مال
لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (المائدہ - ۹)	کھانے سے منع کیا؟ یہ بہت برا تھا جو وہ کرتے تھے
لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پہ

عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ۔ داؤد اور عیسٰی بن مریم کی زبان سے لعنت کرائی گئی۔ اس
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ۔ كَانُوْا لیے کہ انہوں نے سرکشی کی اور وہ حد سے گزر جاتے تھے
لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ وہ ایک دوسرے کو بُرے افعال سے نہ روکتے تھے۔

اس آخری آیت کی تفسیر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احادیث منقول ہیں وہ قرآن حکیم کے مقصد کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہیں۔ سب روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور نے فرمایا:۔

"بنی اسرائیل میں جب بدکاری پھیلنی شروع ہوئی تو حال یہ تھا کہ ایک شخص اپنے بھائی، دوست یا ہمسایہ کو بُرا کام کرتے دیکھتا تو اس کو منع کرتا کہ اے شخص خدا کا خوف کر۔ مگر اس کے بعد وہ اسی شخص کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتا اور یہ بدی کا مشاہدہ اس کو اس بدکار شخص کے ساتھ میل جول اور کھانے پینے میں شرکت کرنے سے نہ روکتا۔ جب ان کا یہ حال ہو گیا تو ان کے دلوں پر ایک دوسرے کا اثر پڑ گیا اور اللہ نے سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا اور ان کے نبی داؤد اور عیسٰی بن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی۔"

راوی کہتا ہے کہ جب حضور سلسلۂ تقریر میں اس مقام پر پہنچے تو جوش میں آ کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا:۔

"قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور بدی سے روکو اور جس کو بُرا فعل کرتے دیکھو اس کا ہاتھ پکڑ لو اور اُسے راہ راست کی طرف موڑ دو اور اس معاملہ میں ہرگز رواداری نہ برتو۔ ورنہ اللہ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دے گا اور تم پر بھی اس طرح لعنت کرے گا جس طرح بنی اسرائیل پر کی۔"

یہ حدیث بتاتی ہے کہ قوم پر تباہی اُس وقت آتی ہے جب پوری کی پوری قوم مفاسد کا شکار ہو جاتی ہے اور اُس قوم کے نیک لوگ بھی برائیوں سے سمجھوتہ کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔ فسق و فجور کے ساتھ مفاہمت کی بڑی وجہ افراد میں تعیشی ذہنیت کا پیدا ہونا ہے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ بچو اس فتنہ سے جو صرف انہی لوگوں کو مبتلائے مصیبت

ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً۔ ذکرے گا جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا

ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا منشا اس سے یہ ہے کہ بدی کو اپنے سامنے نہ ٹھیرنے دو، کیونکہ اگر تم بدی سے رواداری کروگے اور اس کو پھیلنے دوگے تو اللہ کی طرف سے تم پر عذاب نازل ہوگا اور اس کی لپیٹ میں اچھے اور برے سب آجائیں گے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تشریح اس طرح فرمائی ہے:۔

ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل خاصۃ حتی یروا المنکر بین ظھرانیھم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکرون فاذ فعلوا ذالک عذب اللہ الخاصۃ والعامۃ۔	اللہ خاص لوگوں کے عمل پر عام لوگوں کو عذاب نہیں دیتا۔ مگر جب وہ اپنے سامنے بدی کو دیکھیں اور اس کو روکنے کی قدرت رکھنے کے باوجود اس کو نہ روکیں تو اللہ خاص اور عام سب کو مبتلائے عذاب کر دیتا ہے۔

لہٰذا کسی قوم کی بربادی کی اصل وجہ ذلیل مقاصد کی طلب ہے۔ یہ ذلیل خواہشیں انسان کے اندر تخلیقی قوتوں کو بالکل نیست و نابود کر دیتی ہیں۔ جو لوگ ان کو پورا کرنے کے لیے ہر وقت دوڑ دھوپ کرتے رہتے ہیں وہ اخلاقی لحاظ سے نہایت ہی پست سطح پر آجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جن لوگوں سے یہ مقاصد پورے کیے جاتے ہیں اُن کی ذہنیت بھی بگڑ جاتی ہے اُن کے اندر وہ جرأتِ ایمانی ختم ہو جاتی ہے جس کو کام میں لا کر وہ ان برائیوں کو روک سکیں۔ وہ اپنے اندر تحریص و ترغیب کی یورش کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں پاتے اور اپنے آپ کو فسق و فجور کے اس سیلاب میں کھو بیٹھتے ہیں۔ اس وقت خدا انہیں اُن کی بداعمالیوں کی وجہ سے پکڑ لیتا ہے:۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۔ (بنی اسرائیل)	اور جب ہم کسی آبادی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے دولتمندوں کی تعداد میں اضافہ کر دیتے ہیں اس لیے وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اب اُس پر ہمارا قانونِ فطری منطبق ہو جاتا ہے

اور ہم اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔

علامہ ابنِ خلدون نے مذکورہ بالا آیت کو اصل قرار دے کر زوالِ تمدن پر جو جامع اور مفصل فلسفیانہ مضمون لکھا ہے اُس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"جب شہری لوگوں کو دولت و ثروت مل جاتی ہے تو وہ فطرۃً ان کو تمدنی ساز و سامان کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ اس لیے اُن کے کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے کی تمام چیزوں میں رنگینی اور رانجگی پیدا ہو جاتی ہے اور جب رنگین مزاجی اس درجہ کو پہنچ جاتی ہے تو انسان شہوانی خواہشوں کا غلام ہو کر دین و دنیا دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس وقت لوگوں کے مصارف میں اضافہ ہو جاتا ہے اور چونکہ سلطنت کے عین شباب کے زمانے میں تمدن اپنی انتہائی ترقی کو پہنچ جاتا ہے اور ہر سلطنت میں ٹیکس لگانے کا بھی زمانہ ہوتا ہے کیونکہ اس وقت سلطنت کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں اور ٹیکس کا تمام تر بار تجارت پر پڑتا ہے کیونکہ تجارت پیشہ لوگ جو کچھ صرف کرتے ہیں اس کو اسبابِ تجارت ہی سے وصول کرتے ہیں اس لیے ٹیکس اشیاء کی اصل قیمت کا جزو ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متمدن لوگوں کے اخراجات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں اور اُن کی تمام آمدنی انہی مصارف میں صرف ہو جاتی ہے اور وہ مفلس اور محتاج ہو جاتے ہیں۔"

حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اس مسئلہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گذر گئیں اور دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی بنا لیا اور آخرت کو بھلا دیا اور شیطان نے اُن پر غلبہ کر لیا تو اب اُن کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور ان میں کا ہر شخص سرمایہ داری اور تمول پر فخر کرنے اور اترانے لگا۔ یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے جو بجا عیش پسندوں کو داد عیش دینے کے لیے عیش پسندی کے

نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامانِ عیش مہیا کرنے کے لیے عجیب و غریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور قوم کے اکابر اس جدوجہد میں مشغول نظر آنے لگے کہ اسبابِ تعیش میں کس طرح وہ دوسروں پر فائق ہو سکتے اور ایک دوسرے پر فخر و مباہات کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے امرأ اور سرمایہ داروں کے لیے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان کی کمر کا پٹکا یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو، یا اُن کے پاس عالیشان سر بفلک محل نہ ہو جس میں پانی کے حوض، سرد و گرم حمام بے نظیر پائین باغ ہوں اور ضرورت سے زائد نمائش کے لیے بیش قیمت سوریاں، حشم و خدم اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں، اور صبح و شام رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں اور جام و سبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو۔ اور جس کا ذکر قصہ طولانی کے مترادف ہے۔ . . .

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت کی یہ حالت تھی کہ دلوں کا امن و سکون مٹ گیا تھا، ناامیدی اور کاہلی بڑھتی جاتی تھی اور بہت بڑی اکثریت رنج و غم اور آلام و مصائب میں گھری نظر آتی تھی، اس لیے کہ ایسی مفرطانہ عیش پرستی کے لیے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی۔ البتہ اس کے لیے بادشاہ، نواب، امراء اور حکام نے معاشی دستبرد شروع کر دی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشتکاروں، تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کاروباریوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کر کے ان کی کمر توڑ دی اور انکار کرنے پر ان کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کر کے ان کو ایسے گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنا دیا جو آبپاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں اور پھر کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات و ضروریات کے مطابق بھی کچھ نہ کچھ پیدا کر سکیں۔ خلاصہ یہ کہ ظلم و بداخلاقی کی انتہا ہو گئی۔ . . .

آخر جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی اور مرض ناقابلِ علاج حد تک پہنچ گیا تو خدائے تعالیٰ کا غضب بھڑک اُٹھا اور اُس کی غیرت نے تقاضا کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اُکھڑ جائے اور اس کا قلع قمع ہو جائے۔ . . .

۔۔۔ اُس نے ایک نبی اُمّی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث کیا اور اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا، وہ آیا اور اس نے روم وفارس کی اُن تمام رسوم کو فنا کر دیا اور عجم وروم کے رسم ورواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔

اس نظریہ کی صداقت کو صرف مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام ذہین انسانوں نے قبول کیا ہے۔ چنانچہ لیبان اپنی شہرۂ آفاق کتاب "قوموں کی ترقی اور تنزل کے قوانین نفسی" میں لکھتا ہے:۔

"جب کوئی قوم تہذیب وتمدن کے زیور سے آراستہ اور نفوذ وقوت کے ہتھیار سے مسلح ہو جاتی ہے اور اُس کو ہمسایہ قوم کے حملے کا خطرہ نہیں رہتا تو وہ نہایت عیش وطرب کے ساتھ جو دولت کا لازمی نتیجہ ہے زندگی بسر کرنے لگتی ہے، اس لیے اس کے تمام فوجی محاسن برباد ہو جاتے ہیں۔ تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ضروریات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ہر شخص کے دل میں خود غرضی اپنا قدم جما لیتی ہے اور اس کا مطمح نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ جو مال ودولت اس کے ہاتھ آئے اس سے نہایت سرعت کے ساتھ ذاتی فائدہ اٹھائے۔ اس بنا پر تمام قوم عام مصالح سے اعراض کرنے لگتی ہے، اور قوم کے وہ تمام اخلاقی محاسن فنا ہو جاتے ہیں، جو اس کی عظمت کا حقیقی سبب تھے۔ اب اُس پر قریب وجوار کی وحشی یا نیم وحشی قوموں کا حملہ شروع ہو جاتا ہے، روم اور ایران کی سلطنتوں کا یہی حشر ہوا، اُن کا نظام حکومت اگرچہ نہایت مستحکم تھا، تاہم بابرہ نے روم کا خاتمہ کر دیا اور عربوں نے ایران کے پرخچے اڑا دیئے۔"

دورِ حاضر کے ایک عظیم مفکر پروفیسر آرنلڈ جے ٹائن بی نے بھی اپنی جامع تصنیف "مطالعۂ تاریخ" میں اسی نظریے کی کسی حد تک تائید کی ہے۔ اُس کا کہنا یہ ہے "کہ کسی تہذیب کی نشوونما کا عام طور پر معیار یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ انسانی ماحول پر زیادہ سے زیادہ قبضہ کرے یا طبعی ماحول کو اپنے قابو میں لے آئے۔ پہلی صورت میں پڑوس میں رہنے والی اقوام کو فتح کیا جاتا ہے اور دوسری صورت میں مادی اسباب وذرائع میں ترقی ہوتی ہے"۔ پھر اُس نے نہایت ہی واضح مثالوں سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ نہ تو فوجی تنظیم اور نہ سلطنت کی حدود کا پھیلاؤ کسی تہذیب کی ترقی کا معیا

ہیں۔ فوجی قوت کا بڑھنا بذاتِ خود تنزل کی نشانی ہے۔ اسی طرح پیدائش کے طریقوں میں اصلاح کا بھی کسی تہذیب کی نشو و نما سے کوئی خاص رشتہ نہیں۔ دنیا میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب قوموں میں مال و اسباب کی فراوانی ہوئی تو انہیں انحطاط نے آگھیرا۔"

اس کے بعد وہ لکھتا ہے:۔

"اکیس تمدنوں کے مطالعہ کے بعد میرے دل نے اس حقیقت کو بالکل قبول کر لیا ہے کہ تمدن اسی وقت تک صحت مند رہتے ہیں جب تک ان میں تخلیق کی صلاحیت بر سرِ عمل رہتی ہے اور وہ اپنے جغرافیائی ماحول، نقلِ مکانی یا داخلی تغیرات کے پیدا کردہ ہر چیلنج کا خیر مقدم جدید اور تخلیقی طریقوں سے کرتے چلے جاتے ہیں۔"

"اور جب کسی سوسائٹی میں تخلیقی قوتیں رکھنے والی اقلیت غالب ہو جاتی ہے۔ اور پھر محض قوت کے بل پر اپنے اس وقار کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے جس کی درحقیقت وہ اہل نہیں رہتی تو حاکم اقلیت[1] کے اخلاق میں یہ انقلاب عوام کو بغاوت پر ابھارتا ہے۔" اور اس کے بعد کوئی دوسری قوم یا گروہ مسندِ اقتدار پر آجاتا ہے۔"

قرآنِ حکیم نے اس تغیر و تبدل کی اصل وجہ یہ فرمائی ہے:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ اگر اللہ تعالیٰ بعض انسانوں کو دیگر انسانوں کے

---

[1] فرانس کی شکست کا اصلی سبب یہی اخلاقی انحطاط تھا۔ ایم بادون (M. Baudin) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"میں نے جنرل ویگان سے کہا تھا کہ فرانس میں صرف مادی اور فوجی وسائل کی کمی نہیں بلکہ روحانی قوت کا بھی فقدان ہے۔ اس ملک میں اخلاقی طاقتوں کو شکست ہو چکی ہے۔ فرانسیسی نوجوانوں کو کسی ایسے عقیدہ کی تعلیم نہیں دی گئی جس کے لیے ان کے دلوں میں جان و مال کی قربانی کا جذبہ ہو۔ اگر ملک کو بچانا ہے تو تعمیرِ نو کا کام جلد شروع ہونا چاہیے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں ہر طرف شک و تذبذب اور عقائد کی کمزوری کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ فرانس کا نظم و نسق ایک نا اہل حکمران طبقہ کے ہاتھ میں آگیا ہے۔"

لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ — ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ ۔ (۲۲-۴۰)

اگر اللہ تعالیٰ بعض گروہوں کو دیگر گروہوں کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہتا تو دیر و خانقاہ اور مساجد جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے مسمار ہو جاتیں۔

مذکورہ بالا آیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ اس تغیر کی اصل وجہ یہی ہے کہ خداوند تعالیٰ یہ نہیں چاہتے کہ پوری نوعِ انسانی اخلاقی پستیوں کا شکار ہو جائے۔

جب انسانوں کا کوئی گروہ اس کارزارِ حیات میں اخلاقی شکست کھا جاتا ہے تو پھر کوئی فوجی طاقت زیادہ دیر تک اسے دنیا میں سربلند نہیں رکھ سکتی۔ وہ جلد ہی دنیا سے نیست و نابود ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا گروہ وجود میں آتا ہے جن کی اخلاقی بنیادیں زیادہ استوار اور مرکزی اصول زیادہ جان بخش ہوتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اس عمل کے ذریعہ سے روحِ حیات کی تجدید نہ کریں اور کسی ایک ہی قوم کو غیر معین عرصہ تک اختیارات کی باگیں دے دیں، خواہ وہ اخلاقی انحطاط کی آخری حد تک ہی کیوں نہ پہنچ گئی ہو تو اس سے معاشرتی زندگی کا امن و سکون بالکل تباہ و برباد ہو جائے گا۔ چنانچہ اسی وجہ سے جب ایک جماعت کو مسندِ اقتدار سے ہٹایا جاتا ہے تو اسی وقت ایک دوسری جماعت اس کی جگہ آ لیتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے ارشاد فرمایا ہے :-

اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْکُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا وَّیَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ وَلَا تَضُرُّوْہُ شَیْئًا

اگر تم لوگ جہاد کے لیے نہ اٹھ کھڑے ہوئے تو خدا تم کو سخت عذاب دے گا اور تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا اور اس کو تم کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔

فَاَھْلَکْنٰھُمْ بِذُنُوْبِھِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِھِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ،

ہم نے ان کے گناہوں کے باعث ان کو ہلاک کر دیا اور اس کے بعد دوسرے لوگوں کو پیدا کیا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِہٖٓ اِلَیْکُمْ ۭ وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ

اگر تم اعراض کرتے ہو تو میں نے اپنا پیغام تم تک پہنچا دیا۔ میرا رب تمہارے سوا کسی دوسری قوم کو اپنا جانشین بنا لے گا

وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْئًا۔ اور تم اسے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

علامہ ابن خلدون اسی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"جب بانیانِ سلطنت عیش و طرب میں معروف ہو جاتے ہیں تو اپنے دوسرے بھائیوں کو غلام بنا لیتے ہیں اور ان کو سلطنت کے کاروبار میں لگا دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے سلطنت میں کوئی حصہ نہیں پایا ہے چونکہ انہوں نے ناز و نعم میں زندگی نہیں بسر کی ہے اس لیے وہ زحمان باقی رہتے ہیں اور جب پہلے لوگ عیش پرستی کی وجہ سے بوڑھے ہو جاتے ہیں تو دوسرے گروہ کی عصبیت تازہ رہتی ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنا مرجعِ امید اس ملک کو بنا لیتے ہیں جس سے وہ روک دیئے گئے تھے۔ چنانچہ عرب میں جب عاد کی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو ان کے بھائی ثمود صاحب تخت و تاج ہوئے۔ ثمود کے بعد عمالقہ، عمالقہ کے بعد حمیر۔ حمیر کے بعد تبابعہ اور تبابعہ کے بعد اذواء کا دور دورہ ہوا۔ اس کے بعد مصر کی حکومت قائم ہوئی"

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ (اور یہ زمانہ کے انقلاب ہیں جن کو ہم لوگوں میں گردش دیتے رہتے ہیں۔)

صلاح و فساد

از جناب محمد زبیر صاحب (ایم اے)

مقامات :-

ا - عیش یا خوشی Epicureanism

ب - افادیت Utilitarianism

ج - جان اسٹوارٹ مل کا نظریہ نوعیتِ عیش Quality of pleasure

د - نیکی کا معروضی نظریہ یا خارجی تصور Objectivity of Good

ہ - قرآن حکیم

ا

تم بدی اور غم دونوں سے بھاگتے ہو۔ اس لیے یہ دونوں ہمارے موضوع سے خارج ہوئے۔ مگر خوشی اور بھلائی؛ تم ان دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے ہو۔ صبح و شام ان کے لیے بیقرار پھرتے ہو۔ پھر اسے کیا کہو گے جو تمہیں اُن کے مساکن کو جانے والی سیدھی اور قریب کی راہ سے آشنا کر دے ؟

جس منزل کی راہ پوچھتے ہو پہلے اسے متعین کر لو۔ اس لیے کہ یہ مسافر کا اپنا فرض ہے ہیں کدھر جاؤں ؛ یہ کسی سے نہیں پوچھا کرتے۔ جدھر جانا چاہتا ہوں اس کا راستہ کونسا ہے ؛ یہ البتہ پوچھنے کے قابل بات ہے۔

۱۔ کیا خوشی نہیں دکھ اور نقصان پہنچاتی ہے ؟ ——— ایسا ہوتا تو تم اُسے ڈھونڈتے کیوں ؟

۲۔ نقصان نہیں تو کیا فائدہ اور بھلا ہوتا ہے ؟ ——— تیسری تو کوئی صورت ہی نہیں

۳- خوشی پھر بھلائی ٹھیری- تمہارے لیے سُود مند اور بہتر ثابت ہوئی ———— یقیناً!
تمہاری منزل پھر صرف خوشی ہوتی- خوشی اور بھلائی، الفاظ دو تھے، مگر اصل مقصود صرف خوشی نکلی-
حقیقتِ حال کا یہ فیصلہ پھر دُہرا لو "خوشی میں نقصان ہوتا تو تم اُسے نہ ڈھونڈتے اور نہ قبول کرتے"
زندگی کے سارے ایام تمہارے سامنے کھلے ہیں- انہیں غور سے دیکھ جاؤ- کیا وہ تمہارے اس فیصلہ
کی تصدیق کرتے ہیں؟

بچوں نے اُسے مٹی کے گھروندوں میں ڈھونڈا اور پایا- مگر جب ان کی خوشی کی جگہ بھوک، رات
کی تاریکی اور تکان کی خلش نے لے لی تو وہ گھروں کو پلٹ آئے- اُسی خوشی کو پھر انہوں نے کھانے اور
سونے میں تلاش کیا- کھانے میں کونین کی تلخی اور بستر پہ کانٹوں کی چبھن ہوتی تو وہ نہ کھانے نہ لیٹتے-

حیوانات کو اسی کی جستجو ہے- ہرن سبزہ زاروں میں چوکڑیاں بھرتا دُور نکل گیا ہے، مگر اُس کے
دل سے پوچھو کہ شکاری کتوں کا غم آفریں تصوّر بھی اُسے کس قدر بار ہو رہا ہے-

نیک آدمی کو دیکھو، وہ اپنی نیک عملی کی زندگی میں لُطف اُٹھا رہا ہے اور خوش ہے-

تو پھر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ خوشی، مسرت، یا عیش، نیکی ہے؟

۳۵۵ ق م میں یونانی حکیم ابیکیورس (**Epicurus**) نے حصولِ مسرت کو ہی
انسان کے ہر فعل کی غایت الغایات بتایا، مسرت کا حاصل کرنا، زندگی کو عیش و لذت میں کاٹ دینا،
اُس کے پیرؤوں اور اُس کے اپنے نزدیک سب سے بڑی بھلائی ہے- یہی ایک محور ہے جس کے گرد ہماری
ساری زندگی گردش کرتی ہے- صرف انسان کی نہیں بلکہ حیوان اور دوسری مخلوقات کی بھی- ایک آرزو
ہے جو اس کارخانۂ حیات کو آباد کیے چلی آ رہی ہے، اور وہ صرف لذت کے حصول کی آرزو ہے - وہ
دلیل لاتے ہیں کہ صرف لذت اور خوشی کے ایک عنصر کو حیاتِ ارضی سے نکال دو تو زمین پر بسنے
والی مخلوقات کی ساری کارگاہیں سرد پڑ جائیں گی- پس انسان کا فرض صرف ایک ہے اور وہ خوشی کا
حاصل کرنا ہے- خوشی نیکی ہے، بھلائی ہے، پس وہ جس قدر ہو "بے حد" ہو، اچھی ہے-

اب زندگی کی طرف عود کرو اور دیکھو کہ شواہد و نظائر تمہارے اس فیصلہ کا کہاں تک ساتھ

پیدا کیا ہو اور زمین کا انتظام وہ اپنے دوسرے مقربین کے حوالہ کر کے اس سے بالکل غیر متعلق ہو جائے۔ اسی طرح وہ خدا کو بھی مانتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کے دوسرے سیکڑوں شریکوں کو بھی مانتے ہیں جن کو اس کے دربار میں ایسی رسائی اور تقرب حاصل ہے کہ جس کو چاہیں معاف کرا دیں اور جس کو چاہیں سزا دلا دیں۔ اس کی عبادت کا حق ان کے نزدیک اس سے ادا ہو جاتا ہے کہ مخصوص اوقات میں اس کی پوجا کر لی جائے یا اس کو خوش کرنے کے لیے اس کے حضور میں کوئی نذر گذران دی جائے یا کوئی قربانی پیش کر دی جائے۔ اس عبادت کے مقتضیات میں سے نہ تو یہ بات ہے کہ تنہا اسی کی اطاعت اور غلامی کی جائے اور نہ وہ خدا کی صفات کا یہ کوئی لازمی تقاضا سمجھتے کہ وہ خلق کی ہدایت کے لیے کوئی قانون و کتاب اور کوئی نبی و رسول بھیجے اور انسانوں پر اس کی اطاعت لازمی ہو۔ علیٰ ہذا القیاس وہ خدا کو خالق مانتے ہیں لیکن یہ نہیں مانتے کہ وہ مارنے کے بعد دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ یا انسان کے تمام کھلے اور چھپے سے واقف ہے، یا اس کے ہر کام میں حکمت ہے یا وہ عادل اور قسط کو قائم کرنے والا ہے یا دوسروں کے خوف و لحاظ اور ان کی مدد و اعانت سے بالکل مستغنی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کو نہ ماننے والے اور اس طرح ماننے والے نتیجہ کے لحاظ سے، یعنی خدا سے بے خوفی میں، دونوں برابر ہیں۔ پہلا گروہ اس وجہ سے بے پروا ہے کہ وہ خدا کو مان ہی نہیں رہا ہے اور دوسرا اس وجہ سے مستغنی ہے کہ اس نے خدا سے بچنے کے لیے صد ہا راستے پیدا کر لیے ہیں اس وجہ سے انبیائے کرام پہلے گروہ میں خدا کا اعتقاد پیدا کرتے ہیں اور دوسرے گروہ کے عقیدہ کی اصلاح کرتے ہیں کیونکہ جب تک خدا پر سچا اور پکا ایمان نہ ہو اور وہ ایمان شرک کی تمام آلائشوں سے بالکل پاک نہ ہو اس وقت تک خدا سے تقویٰ ایک بالکل بے معنی لفظ ہے۔ جو شخص خدا کو تنہا مالک اور حاکم مان ہی نہیں رہا ہے آخر وہ اس کی اطاعت و بندگی کیوں کرے؟ جو شخص اس کو علیم و خبیر یقین ہی نہیں کر رہا ہے وہ خلوت و جلوت میں اس سے اس طرح ڈرتا کیوں رہے کہ اس کے کسی حکم کی ادنیٰ خلاف ورزی بھی نہ ہونے پائے؟ اور بالفرض وہ پبلک میں کسی مصلحت سے کوئی کھلی ہوئی نافرمانی نہ کرے لیکن آخر تنہائی میں اس کا خوف اپنے اوپر کیوں مسلط رہنے دے؟ جو شخص اس بات پر عقیدہ رکھتا ہی نہیں کہ خدا عادل اور قسط کو قائم کرنے والا ہے وہ ظلم و ناانصافی سے کیوں ڈرے؟ جو شخص اس بات کا قائل ہی نہیں کہ خدا کو ہماری روزمرہ زندگی سے کوئی تعلق ہے، اور اس نے ہماری اس زندگی کو حدود کے اندر پابند رکھنے کے لیے کچھ قوانین اتارے ہیں، آخر وہ خدا سے ہر قدم پر کانپتا کیوں رہے؟ جس شخص کا اس بات پر ایمان ہی نہیں کہ خدا ہی حاکم علی الاطلاق، بادشاہ اور قانون ساز ہے۔ آخر وہ اپنی یا دوسروں کی حکومت اور قانون سازی کو بغاوت کیوں سمجھے؟ اس وجہ سے تقویٰ پیدا کرنے کے لیے سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ خدا کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق کا صحیح صحیح علم پیدا کیا جائے اس کے بغیر تقویٰ پیدا کرنے کی ساری تدبیریں بالکل اوپری ہوں گی جن سے ممکن ہے خانقاہی قسم کا ایک بالکل غیر متوازن تقشف تو پیدا ہو جائے لیکن وہ تقویٰ ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا جو حدود الٰہی کی کامل محافظت سے عبارت ہے اور جس کو پیدا کرنے کے لیے حضرات انبیائے کرام تشریف لائے تھے۔

دیتے ہیں۔

۱۔ تمہارے خزانے سونے اور چاندی سے پُر ہیں۔ تمہارے ہاں آخر عمر میں بچہ پیدا ہوا ہے۔ احباب کی دعوت پر روپیہ صرف کرتے ہو تو خوشی ہوتی ہے۔ اپنی نمود خود آپ دیکھتے ہو تو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ تم نے خزانوں کے منہ چنانچہ کھول دیے اور جو تھا لٹا دیا۔ اب اُسی بستی میں کچکول لے کر گدائی کرتے ہو تو پھر کیا خوشی بھلائی ہے؟

۲۔ عیش پرستیاں تمہیں اتنی دُور لے گئی ہیں کہ تم جسمانی طور پر معذور ہو کر اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے ہو۔ تو کیا پھر خوشی بھلائی ہے؟

۳۔ سارا گاؤں چوروں کی بستی ہے۔ انہیں چوری میں مسرت حاصل ہوتی ہے۔ باہم کسی کو نہیں چھوڑتے۔ کسی کے ہاتھ سے کسی کی عصمت محفوظ نہیں۔ تم بھی چور ہو۔ آج تمہارا سارا اندوختہ بھی لوٹ لیا گیا اور تمہاری حالت یہ ہے کہ اپاہج اور اندھے ہو چکے ہو۔ چور کو تمہارے گھر سے بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگا ہے۔ مگر تم بتاؤ کہ یہ کارخانۂ حیات کیا مسرت کے محور پر گھوم رہا ہے؟

تم کہو گے، نہیں۔ اس لیے زندگی کے مذہبِ عمل کی تلاش کسی اور گوشہ میں کرنی چاہیے۔

تمہارا یہ فیصلہ تمہارے جسم و جان کے ایک ایک ریشے کی صدائے حال ہے۔ اور یہ صرف تمہارا اور تمہارے عہد کا فیصلہ ہی نہیں ہے بلکہ آغازِ آفرینش سے اب تک افراد اور قومیں اسی ایک نتیجے پر پہنچتی چلی آئی ہیں۔ اگر تم دُور پیچھے ماضی کے تاریک پردوں میں جھانک سکتے ہو تو اقوامِ عالم کی سرگزشت کے سُراغ کو نکلو۔ تم اسی ایک نتیجے پر پہنچو گے جو تمہارے سامنے مرتب ہو رہا ہے۔ تم ہر عہد میں کتنی ہی ایسی بستیاں پاؤ گے، کتنے ایسے افراد اور کتنی ہی ایسی قومیں دیکھو گے جو عیش و عشرت میں غرق ہیں، جن کی زندگیاں صرف عیش پرستیوں کے لیے ہو کر رہ گئی ہیں۔ پھر جب عشرت کی سرمستیاں اُن کے لیے دردناک انجام لے کر آئیں تو شدّتِ دہشت و حیرت سے اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور پھر اُن کے لب و دہن سے جو پکار بلند ہوئی وہ اس کے سوائے کچھ نہ تھی: افسوس ہم پر! ہم انجام کی اس ہولناک گھڑی سے غفلت میں رہے، بلکہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم و شرارت کرتے رہے آخر

وہ اپنی بستیاں چھوڑ کر بھاگے۔

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

(الانبیاء - ۱۱-۱۲-۱۳)

جب ہمارا عذاب انہوں نے محسوس کیا تو دیکھو لیا یک وہ بستیوں سے بھاگے جا رہے ہیں - اب بھاگتے کہاں ہو؟ اپنے اسی عیش و عشرت کی طرف لوٹو جس نے تمہیں اس قدر سرشار کر رکھا تھا - انہی مکانوں میں واپس جاؤ (جنکی مضبوطی کا تمہیں غرہ تھا)، شاید وہاں تدبیر و مشورہ میں تمہاری ضرورت ہو اور تم سے کچھ دریافت کیا جائے - انہوں نے کہا ہم پر افسوس ہم ظالم تھے -

اپیکیورس کے پیروؤں نے بھی اسے محسوس کیا - چنانچہ وہ ایک قدم اٹھا کر آگے بڑھے اور کہا کہ زندگی کی تگ و دو کا مرکز ہے تو خوشی ہی مگر اس کی دو صورتوں میں انسان کے لیے امتیاز کرنا لازم ہے - پہلی صورت اُن مسرتوں کی ہے جو عارضی ہوتی ہیں، ابھی تھیں اب مٹ گئیں - دوسری قسم کی وہ مسرتیں ہیں جو دیرپا ہیں - وہ خوشی جو شدید جذبات اور جوش مثلاً عشق اور غصہ کی بندگی سے حاصل ہوتی ہے پہلی قسم کی عارضی خوشی ہے - اس سے روح کو نسبتہً دکھ زیادہ پہنچ جاتا ہے -

آرام، سکون، امن، احساسات سے کنارہ گیری، یہ دوسری نوع کی مسرتیں ہیں اور دیرپا ہیں اس لیے بہتر ہیں، ایسی حالت کی چنانچہ تلاش کرنی چاہیے جہاں کوئی چیز کسی حال اور کسی وقت انسان کو رنجیدہ نہ کر سکے -

اب آؤ اسے ایک نقاد کی نظر سے دیکھیں - کیا یہ ایک بن باسی جوگی کی زندگی نہیں ہے جو جہد حیات سے کنارہ کش ہو کر بستی سے دُور نکل جاتا ہے؟ وہاں بھی اُسے اگر صبح و شام کے کھانے کی فکر رنجیدہ کرتی ہو، وہاں بھی اگر درندوں سے اس کا دل دہلتا ہو، تو وہ اس کے سوا اور کیا چارہ کار پائے گا کہ زمین و آسمان کے درمیان کوئی مسکن تلاش کرے یا خودکشی کر لے - کیونکہ بن باسی کی زندگی بھی اس کے موافق نہیں بیٹھتی - چنانچہ اپیکیورس کے پیروؤں کا ایک فرقہ اس طرف گیا ہے کہ

خودکشی بہترین بھلائی ہے اور جو انتہائی مسرت چاہے وہ اپنے حلقوم پر چھری رکھے اور خودکشی کرے۔ تاریخ نے اس گروہ کے خودکشی کرنے والوں کے نام محفوظ رکھے ہیں۔ تو پھر کیا خوشی کے حصول کے گرد انسان کی زندگی اور زندگی کے جملہ مطالبات اور فرائض کو مرتب کیا جا سکتا ہے؟ ——— ظاہر ہے کہ نہیں!

ب

افلاطون نے تھیئٹیس (Theaetus) میں ثابت کیا ہے کہ اگر عقل سے الگ ہو کر کوئی مسرت کا تعاقب کرنا چاہے گا تو ٹوٹے میں رہے گا اور اُسے نہیں پائے گا۔ عقل اور فہم سے الگ ہو جانا اس کے نزدیک ایک ہی وقت میں اپنے حافظے سے الگ ہو جانا ہے، مستقبل اور ماضی سے کٹ جانا ہے۔ نہ مستقبل کی خوشیوں کا انتظار اور تیاری، نہ ماضی کی خوشیوں کی یاد اور لذت بھلا جو عقل کو تیاگ کر خوش رہنا چاہے وہ سوچے گا کیوں؟ کل وہ اسی ماں کا بیٹا تھا۔ وہ اسے یاد رکھے تو کیوں؟ اس کے فرائض کو ادا کرے تو کیوں؟

افلاطون کا مقام اسی حکیم کے قریب نظر آتا ہے، اس نے کہا :۔

سچی اور جھوٹی خوشی میں امتیاز کرو۔

آسودہ اور پاک خوشی میں فرق کرو۔

شریف اور وضیع میں فرق جانو۔

افلاطون کے نتائج فکر سے آگے بینتھم (Jeremy Benthan 1748-1832) کی کربد شروع ہوتی ہے۔ اُس نے ریاضی کے ٹھوس اور محسوس اصول پر مسرت کے اس فلسفے کو تحویل کیا اور یوں اس کی ایک عملی صورت نکالی۔ اس کی تفصیل کو سمجھ لو۔

ہمارے سامنے مسرت انگیز مشاغل کی ایک فہرست آ گئی ہے۔ جوانی کی اٹھان اور جذبات کے طوفان کا مطالبہ یہ ہے کہ ساری عشرتیں اپنے دامن میں لپیٹ لی جائیں۔ اور دل نے یہ کہہ دیا ہے

کہ لطف اندوزی ہی جب مدعائے حیات ہے تو یکبارگی ایک ہی فرصت میں سب کو دیوانہ وار شروع کر دیا جائے۔ مگر افلاطون نے متنبہ کر دیا ہے کہ یوں عقل و فہم سے جدا ہو کر خوشی کے تعاقب میں نکلو گے تو گھاٹے میں رہو گے۔ اس لیے تمہارا طریقِ کار یہ ہونا چاہیے کہ ساری فہرست میں سے پسندیدہ خوشی کا انتخاب کر لو۔ اب سوال یہ ہوا کہ یہ کیسے کریں ؟

بنتھم کہتا ہے کہ جس طرح تم ریاضی کے اعداد کو جمع کر لیتے ہو اور پھر ایک صحیح نتیجہ اخذ کر کے مطمئن ہو جاتے ہو، ٹھیک اسی طریق پر جتنی مسرتیں تمہیں اپنی طرف بلا رہی ہیں اُن پر ذیل کے چار گوشوں سے نگاہ ڈالو اور نتائج کو ایک جگہ جمع کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ انہوں نے تمہیں بلایا اور تم دیوانے ہو کر دوڑ گئے۔

چار گوشے :۔

۱۔ کیا اس کام سے یقینی طور پر خوشی حاصل ہو گی یا یہ غیر یقینی آرزو ہے ؟

۲۔ کیا یہ خوشی حاصل ہونے والی ہے، غم کی ہر ممکن آلودگی سے پاک اور صاف ہے ؟ یعنی اس میں کوئی ایسا پہلو تو نہیں جو سامنے آکر ہماری عشرت کو مکدر کر دے ؟

۳۔ کیا یہ دیرپا ہو گی یا جلدی مٹ جانے والی ہے ؟

۴۔ حاصل ہونے والی خوشی کی مقدار کس قدر ہے، بے کراں ہے یا تھوڑی سی ؟

اب اگر اس تحقیق کے نتائج کا مطالبہ تمہارے حق میں ہے تو بس جو بھی عشرت تمہارے سامنے آگئی ہے کر گزرو، وہ تمہارے لیے بھلائی ہے۔ اپنی اس شکل میں زندگی کا یہ افادی نظریہ (Philosophy of Utility) ہے کام صرف وہ کرو جس میں سب سے کم زحمت اٹھانی پڑے اور سب سے زیادہ عیش کی مقدار ملے یہی نیکی ہے۔ یعنی نیکی تمہارا ایک ذاتی اور انفرادی انتخاب ہے۔ تمہارا ذاتی رجحان ہے۔ اصطلاحی زبان میں نیکی کی حیثیت موضوعی یا داخلی (Subjective position) ہے۔ تمہارے اپنے اندر کی آواز اور ذاتی میلان کے ماتحت اس کی شکل بدلتی رہتی ہے۔

ابھی یہ مقام اپنی پوری کیفیت اور مطالبات کی رو سے شاید واضح نہ ہوا ہو اس لیے رک جاؤ تاکہ اسے کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا جائے۔ چند سطور پیچھے لوٹ کر پھر بنتھم کے ان چار معیاری

اصولوں پر پہنچ جاؤ۔ وہ یہ ہیں:۔

۱۔ خوشی یقینی ہے یا غیر یقینی؟

۲۔ اس میں غم کی کوئی آلودگی تو نہیں؟

۳۔ وہ دیر پا ہے یا عارضی؟

۴۔ زیادہ ہے یا تھوڑی؟

اب انہی معیاروں کو سامنے رکھ کر دیکھو۔ ایک عورت بادشاہِ وقت کی بیوی ہے۔ جوان ہے۔ نہایت خوبصورت ہے۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں۔ وہ اپنے غلام پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اپنے عظیم الشان محل کے ایک ایسے اندرونی حصے میں جہاں کسی راز کے کھلنے کا اندیشہ نہیں اس غلام کو طلب کرتی ہے اور اپنے مطالباتِ جنسی اس کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ دولت، حسن، جوانی اور عیشِ جاودانی سب اس غلام کے قدموں میں ہیں اور ملکہ کی شیفتگی، اس کی دانشمندی اور اس کا اپنا مفاد، ہر چیز اس امر کی ضمانت دے رہی ہے کہ اس کا مطالبہ قبول کر لینے میں غلام کے لیے مزے ہی مزے ہیں۔

اب غور کرو: (۱) غلام کے لیے خوشی یقینی ہے کسی شک کی اس میں گنجائش ہی نہیں۔ (۲) اس عیش میں غم کی کوئی آلودگی نہیں، وہ ملکہ کی حفاظت میں ہے اور ملکہ کا اپنا مفاد یہ چاہتا ہے کہ راز کھلنے نہ پائے۔ البتہ اس کی خواہش رد کر دینے میں جان تک کا خطرہ ہے۔ (۳) ملکہ اس پر ہزار جان سے فدا ہے، اس لیے یقینی ہے کہ جینے جی غلام کے پاؤں دھو دھو کر پیتی رہے گی۔ (۴) خوشی کی مقدار بے حد و حساب ہے۔ ایک غلام اور ملکۂ وقت اس کے قابو میں ہو۔ مال بھی، جمال بھی، عیش و محبت بھی، اور حکومت و اقتدار بھی۔ اس خوشی میں آخر کس چیز کی کمی ہے؟

دیکھو چاروں معیار پورے ہو رہے ہیں بنتھم کی افادیت کا صاف صاف مشورہ یہ ہے کہ غلام کو اپنے جسم و جان کی پوری قوت کے ساتھ، اپنے دامنِ مطلب کو پورا پھیلا کر اس خوشی کو سمیٹ لینا چاہیے۔ نادان ہو گا اگر اس موقعہ کو ہاتھ سے دے گا۔

بنتھم کے نزدیک ایسی خوشیاں نیکیاں ہیں اور ابنِ آدم پر ان کی تلاش فرض ہو چکی ہے۔ جو مثال

ہم نے دی ہے اس نوعیت کی مثالیں عام نہیں تو نہ ہوں، نایاب نہیں ہیں۔ کیا ایک چور کو ایسے مواقع بہم نہیں پہنچ سکتے جن میں بنیتھم کے چاروں معیار پورے ہوتے ہوں؟ کیا بہت سے رشوت خوار حاکم ہماری آنکھوں کے سامنے یقینی، بے غم، دیرپا اور بے حساب خوشی جمع نہیں کر رہے ہیں؟

یہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ ایپکیورس کے اندھے عیش پرست سے افلاطون اور بنیتھم کا دانا عیش پرست بہتر ہے جو چوری، زنا اور جھوٹ کا مرتکب ہونے سے پہلے موقع دیکھ لیتا ہے۔ مگر جس بات پر دونوں متفق ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کے لیے اس کی اپنی انفرادی صواب دید سے الگ نیکی کا کوئی دستور نہیں۔ جسے تم اچھائی سمجھتے ہو لازم نہیں کہ تمہارے دوست بھی سمجھیں، لازم نہیں کہ تمہاری نیکی سماج کے لیے بھی نیکی ہو۔

بنیتھم کا پیرو رحمدل ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ دانا ہے اور افادیت کا مطالبہ یہ ہے کہ جب کل اُس پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹے گا تو کوئی اس پر رحم کرے گا۔ وہ تمہارا دوست ہو سکتا ہے، مگر اس امید پر کہ جب وہ آلام میں گھر جائے گا تو تم دوستی کرو گے۔ وہ اپنا عہد اس لیے استوار رکھتا ہے کہ دوسرے اس سے بدعہدی نہ کریں۔

اس قسم کی سیرت کیا انسان کے لیے موزوں ہے؟ تم پکار اٹھو گے کہ نہیں۔ اخلاقیات کے مفکرین بھی تمہارے ساتھ ہم زبان ہیں، مگر وہ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔

پہلا گروہ جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) کا پیرو ہے جس نے خوشی کی نوعیت کو انتخاب و عمل کا معیار قرار دیا۔

دوسرا گروہ کانٹ (Kant) کی سرکردگی میں نکلتا ہے اور نیکی کا ایک خارجی یا معروضی وجود (Objective entity of Good) تسلیم کرتا ہے۔ کلیسائی مفکرین کی حمایت اس کے ساتھ ہے۔

ج

جان سٹوارٹ مل کہتا ہے کہ تم اپنی تاجرانہ زندگی کے پورے پھیلاؤ کو اگر غور سے دیکھ سکو تو تمہیں نظر آئے گا کہ ہمیں تم بنیتھم کی طرح صرف یہ نہیں دیکھتے کہ تم اپنے داموں سے زیادہ سے زیادہ کون سا سامان خرید

سکتے ہو۔ بلکہ تم یہ بھی سوچتے ہو کہ سامان تھوڑا ہو تو ہو مگر بذاتِ خود اچھا ہو۔ تم صرف (Quantity) کمیت ہی نہیں بلکہ کیفیت (Quality) دیکھتے ہو۔ لہٰذا بنتھم نے ہمیں جو یہ بتایا تھا کہ نتائج کو جمع کر لو اور پھر تعداد دیکھ لو کہ وہ کم تو نہیں، مسرت کے انتخاب کا یہ طریقہ صحیح نہ ہُوا۔ بلکہ صحیح یہ ہُوا کہ مسرت کی مقدار کم ہو تو ہو مگر اس کی نوعیت و کیفیت اچھی ہو۔ نہایت ہی اچھی نوعیت کی خوشی ایک لمحہ کے لیے ملتی ہے تو لے لو۔ بُری قسم کی خوشی ایک سال کے لیے میسّر آتی ہے تو چھوڑ دو۔

خوشی کی نوعیت کا اب کیسے پتہ چلے؟ کیسے یقین آئے کہ فلاں عیش گو مقدار میں تھوڑا ہے مگر مقابلۃً اعلیٰ قسم کا ہے؟ خود سٹوارٹ مل سے یہ سوال کیا گیا۔ اُس نے کہا میرے نزدیک اس کا جواب صرف ایک ہے۔ خوشی کے کوئی سے دو کاموں میں سے نوعیت میں اچھا وہ ہو گا جسے سب یا قریبًا سب اچھا سمجھیں۔ بشرطیکہ وہ ان دونوں کو تجربۃً دیکھ چکے ہوں، اور ہر مجلسی دباؤ سے بے نیاز ہو کر اس کے بارے میں رائے دے رہے ہوں۔ اب اگر اس کی راہ کٹھن بھی ہو گی تو میں اُسے اختیار کر لوں گا مثلاً:-

ایک بنیا کہتا ہے کہ افسانہ نگاری میں کیا دھرا ہے۔

ایک پہلوان کا خیال ہے کہ شاعری کے مقابلہ میں کشتی لڑنے میں زیادہ مسرّت اور زیادہ عیش ہے۔

مِل کہتا ہے میں ان دونوں کی شہادت کو معتبر نہیں سمجھوں گا کیونکہ شاعری اور افسانہ نگاری کے عیش پر تبصرہ کرنے کے لیے بنیا اور پہلوان کسی طرح بھی موزوں اشخاص نہیں ہو سکتے۔

اب آگے بڑھے تو ایک زاہد مِل سے کہہ رہا تھا کہ "شراب بُری چیز ہے"، پاس سے ایک رندِ خراباتی پکار اُٹھا "ہائے کمبخت تُو نے پی ہی نہیں"۔ اب مِل کسے تسلیم کرے گا؟ بات خضغطے میں پڑ گئی۔ جہاں تک شراب کی قصیدہ گوئی کا تعلق ہے کون ہے جو اُردو اور فارسی شاعری کی شہادتیں صفحۂ ہستی سے مٹا سکے۔

در عہدِ تنگ دستی در بادہ کوش و مستی   کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را   حافظ

اور اُردو نے تو مُہر لگا دی کہ خواہ تصوف کے مسائل ہی بیان کیوں نہ کرنے ہوں، ساغر و مینا کے

بغیر بات نہیں بنتی ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر غالب

سبحان اللہ! بادہ و ساغر کے الفاظ میں کس قدر شیرینی ہے کہ "غالب کے ہمعصر" یا "ہندوستان کے رہنے والے" کسی اور چیز کا نام تک سُننا گوارا نہیں کرتے۔ مگر ذرا آگے چل کر دیکھو۔ وہی انسان جس کا فتویٰ یہ تھا کہ شراب "قارون کند گدارا" وہ بوڑھا ہو کر ایک دوسرا ہی مشورہ دے رہا ہے:۔

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو رندی و خراباتی در عہدِ شباب اولیٰ

اب تم اُس کا کونسا مشورہ قبول کرو گے؟ پہلا یا دوسرا؟ کیا دوسرا؟ کیوں؟ تم کہو گے "اس نے یہ طویل تجربہ کے بعد کہا"۔ مگر شراب پر رائے رکھنے کے لیے "پیری" ہی کیوں مناسب سمجھی جائے؟ یہ عہد تو وہ ہے جب عہدِ شباب اور یوں کہو کہ زندگی کی ساری صلاحیتیں چھوڑ کر رخصت ہوتی ہیں اور تم جوان ہو۔ پھر بڑھاپے کی رائے کیوں قبولِ کرنے لگے؟

کیا تم نے نوعیتِ عیش کی تلاش کا یہ طریق مقرر کر کے ٹھوکر نہیں کھائی؟ "عیش کی نوعیت" نکتہ تو خوب تھا مگر وہ خود اس کی بلندیوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

د

فلاسفہ کا ایک دوسرا گروہ اب کانٹ کی سرکردگی میں آگے بڑھتا ہے۔ کلیسائی مفکرین اس کے جلو میں ہیں۔ نتائج کے الجھاؤ کا کھوج لگاتے ہوتے وہ اُس چشمۂ فکر تک پہنچے جہاں سے اس پہلے گروہ کے جملہ افکار سیرابی حاصل کرتے تھے۔ انہوں نے کہا غلطی فروع میں نہیں اصل میں ہے۔ دلائل کے درخت کی ٹہنیوں اور پتوں میں نہیں بلکہ جڑ میں ہے۔ یہ کہنا کہ خوشی نیکی یا بھلائی ہے، یہی بنیادی لغزش ہے۔ نیک عملی کی زندگی میں اکثر و بیشتر ایسے مواقع آجاتے ہیں جن کی راہ ماتم، دُکھ اور مصائب کے کانٹوں سے پُر ہوتی ہے۔ مثلاً حفظِ وطن کے لیے غازی اژدرِ دم توپوں کے سامنے جا رہا ہے۔ وقت کے جابر ہاتھ سچ کہنے والی زبان کو گدّی سے کھنچوا رہے ہیں۔ گو نیکی کی راہ چلنے والوں کو بعض اوقات خوشی نصیب ہو جاتی ہے مگر نیکی اور خوشی لازم ملزوم نہیں۔ اس لیے خوشی کو بھلائی قرار دینا

فیصلے کی غلطی ہے۔

اچھا، مان لیا کہ خوشی نیکی نہیں ہے۔ پھر نیکی آخر ہے کیا چیز؟ بہ محصلین: کانٹ اور اس کے پیرو، جواب دیتے ہیں "وہ ایک فعل ہے جس میں خود اپنا حُسن ہوتا ہے" "ہمیں اسے کیوں اختیار کرنا چاہیے؟" وہ کہتے ہیں "نیکی کو ہمیں اُس کے اپنے حُسن کے لیے اختیار کرنا چاہیے" صداقت اور حُسن بذاتِ خود بھلے ہیں - زنا بذاتہ برائی ہے - یعنی نیکی اپنے الگ وجود کے ساتھ قائم ہے (Objective existence of Good) وہ محاسن کی ایک فہرست ہے، اخلاق کا ایک ضابطہ ہے جس پر تمہیں چلنا ہے - عیش نہیں بلکہ یہ ضابطۂ حیات زندگی کا محور ہے - اس ضابطہ کی زندگی کو کانٹ Formalism کہتا ہے -

کانٹ نے نیکی کا جو تصور ہمارے سامنے رکھا ہے - وہ اپنے اجمال میں یہ ہوا:-

(ا) نیکی کا ایک خارجی وجود ہے -

(ب) خوشی اور نیکی لازم ملزوم نہیں - نیکی کو ہم اُس کے نیک وجود کے لیے پسند کرتے ہیں، خوشی کی غرض سے نہیں کرتے -

نیکی کا اگر کوئی ایسا خارجی و معروضی ضابطہ ہے جسے انسانی فطرت تعمیر نہیں کرتی اور جس کی پیروی میں یہ بھی لازم نہیں کہ انسان کو خوشی نصیب ہو، تو پھر اُس کا مُصنّف کون ہے؟ ماضی یا حال کے انسانی تجربات کو اگر اس کا مُصنّف کہا گیا تو یہ انسان کا ایک ذاتی و داخلی فعل ہو جائے گا، خارجی و معروضی نہ رہے گا - مفکرین کی پہلی جماعت نے بھی تو یہی کہا تھا - انہوں نے بھی تو خود انسان کے اندر پیدا ہونے والے ایک جذبے یا روشنی کو اس کے لیے کافی سمجھا تھا - اب دونوں میں اختلاف کونسا رہ گیا؟ کیا صرف یہی کہ محصلین کے پہلے گروہ نے انسان کے دو اصولی جذبات غم اور خوشی میں سے خوشی کو اپنی جانوں کے لیے بہتر سمجھا؟ کیا وہ غم اور دُکھ کو انتخاب کرتے؟ وہ ایسا کیوں کرتے؟ انسان نے اپنی سلذی سرگزشت میں کہیں بھی اور کبھی بھی تو ایسا نہیں کیا -

یہ استدلال ایک دوسرے گوشے کو بھی بے نقاب کر رہا ہے - وہ یہ کہ غم کو انسان طبعًا پسند

نہیں کرتا؛ رہ گئی خوشی تو خوشی کا انتخاب کانٹ کی نگاہ میں برائی ہے۔ یعنی انسان کو اس کی جبلت پر نہیں چھوڑا جاسکتا، اس کی فطری روشنی پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

کلیسائی مفکرین بھی اس کے ساتھ آواز ملاتے ہیں کہ ہاں نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اس لیے کہ وہ انسانی فطرت کو اعتماد کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اُن کا خیال ہے کہ انسان کی سرشت میں گناہ ہے۔ سولھویں صدی مسیحی تک ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا صرف یہی ایک تعلیم مرکز بنی رہی۔ سینٹ پال کی طرف جو ابنیتِ مسیحؑ کی تعلیم منسوب کی جاتی ہے اس کی تمام تر بنیاد صرف اسی ایک خیال پر رکھی گئی تھی۔ اس کلیسائی تعلیم کے نفوذ کا یہ عالم ہے کہ مِل د فلسفۂ لذت کا داعی) جب خوشی میں "نوعیت" کا عنصر پیدا کرنا چاہتا ہے تو اُسے انسانی فطرت میں کوئی صلاحیت نظر نہیں آتی۔ وہ بھی انسانی سرشت کے گناہ سے اس درجہ خائف ہے کہ وہ یہ نہ کہہ سکا کہ انسان خود اپنی فطرت کی پیروی کرتے ہوئے بھی بھلائی کو پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ وہ دلائل کے مواخذہ سے دامن بچا کر گزرنا چاہتا ہے۔ اور صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ کہ

Many Stoic as well as Chistian elements

should be introduced in Morality

"ہمیں اخلاقیات میں رواقی اور عیسائی عناصر کو شامل کر لینا چاہیے۔"

ظاہر ہے کہ یہ الفاظ اس کی معذوری کے آئینہ دار ہیں۔ یہاں دلیل اس کی معاونت نہیں کر رہی ہے۔

کلیسا نے الہام کو نیکی کا خارجی مصنف کہا (اسلام میں الہام کا تصور بالکل جداگانہ ہے اور وہ اپنے مقام پر بسط سے آئے گا) اور اس سے نیکی کا یہ معروضی تصور قائم ہوا۔ مگر اس تصور کو سترھویں صدی مسیحی میں ایک آخری جہلک ضرب پہنچی۔ عیسائی مبشرین نے دور دست جزائر میں سفر کیے۔ زمین کے ایسے کونوں تک پہنچے جہاں ابنیتِ مسیحؑ اور کفارہ کی کوئی آواز نہ پہنچی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں کے بسنے والے اخلاق کے نہایت بلند اصول پر کاربند تھے۔

آخر کار ان ہی سیاحوں کی بدولت "نیک سیرت وحشی" (Virtuous savage) کی نوع کی اصطلاحات وضع ہوئیں۔

فیصلہ طلب امر اب صرف یہ رہ گیا کہ فطرتِ انسانیہ کا مطالعہ کرتے ہوئے خوشی کے مستقین نے ٹھوکر کہاں کھائی اور حقیقت کہاں چھپی ہے؟

۳

جب نباتات اور حیوانات اپنی فطری استعداد کی حدود میں نہایت صلاحیت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور انہیں کسی بیرونی یا انسانی ضابطۂ اخلاق کی ضرورت پیش نہیں آتی تو پھر کیا یہ صرف انسان ہی ہے جس کے لیے اس کی اپنی فطرت میں کوئی راہنمائی موجود نہیں؟ یقیناً یہ انسان نہیں بلکہ جمادات کی کوئی لایعنی شکل ہوگی جس کی زندگی کی عنان تم اس کی اپنی فطرت کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے گھبراتے ہو۔ انسانی اخلاق کا اصل کار یا مذہبِ عمل دوسری جملہ مخلوقات کی طرح اس کی اپنی سرشت ہی میں تلاش کرنا چاہیے۔ اپیکیورس کے نظریہ یعنی نیکی کے موضوعی تخیل میں صحیح صرف اس قدر ہے کہ تلاش صحیح گوشہ میں کی گئی۔ مگر خامی یہ رہی کہ تلاش کے صرف چند قدم اُٹھا کر ڈھونڈنے والوں نے دم ہار دیا، جو نشانِ منزل تھا اُسے وہ منزل سمجھے اور پھر وہیں بیٹھ گئے۔ وہ معلوم نہ کر سکے کہ اس کی تنقیص سے روشنی آگے بڑھتی ہے۔ چنانچہ ضابطہ کے منکرین (Formalists) نے زندگی کے شواہد سے یہ ثابت کر دیا کہ کوئی ایک شخص ہو یا ایک پوری جماعت عیش طلبی کے جذبات میں گم ہو کر پنپ نہیں سکتی۔ اس کی زندگی میں بناؤ کی جگہ بگاڑ کے آثار اُبھر کر سامنے آجائیں گے۔ تعمیر، قیام اور صلاح کی لطف اندوزیوں کی بجائے زوال، فساد اور فنا سے دوچار ہونا پڑے گا۔

مدنیت کی پہلی اینٹ ماں ہے۔ انسانی تہذیب کی اس سے زیادہ ابتدائی کوئی صورت ذہن میں نہیں آسکے گی کہ کسی جنگل کے ایک گوشے میں ایک ماں ہو اور اُس کی گود میں ایک بچہ ہو جسے وہ جنگل کے وحشی درندوں سے چھپائے پھرتی ہو۔ حفظِ نسل کا یہ پہلا درس ہے جو بچے نے ماں کی گود سے سیکھا۔

عقاب کو بچوں پر لپکتے دیکھ کر ماں نے انہیں سینے سے چمٹا لیا، اور پھر ظلم کی جابر طاقتوں کو روکنے کے لیے اس نے اپنے کمزور اور ناتواں بازوؤں کو پھیلا دیا۔ یہ تو اکثر ہوتا رہا کہ حملہ آور نے اُسے مہلک زخم پہنچائے، مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ ماں نے بچوں کو بچانے کے لیے خود موت کے منہ میں جانا قبول نہ کر لیا ہو۔ نسل کو بچانے کے لیے خود اپنی جان پر کھیل جانے کا یہ دوسرا سبق بھی انسان کو ماں کی گود نے دیا۔

چنانچہ جوان ہوا تو اس نے اسی آئین پر اپنی ماں اور بہن بھائیوں کی نگہداشت کی۔

(۱) انسان جب اپنے اعمال کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے قیام و بقاء کا باعث ہو رہے ہیں، تو اس کے دل و دماغ جس جذبے سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں وہ خوشی ہے۔ خوشی پھر فعل نہیں فعل کا نتیجہ ہوئی۔

(۲) اور جب اُسے یہ نظر آتا ہے کہ اس کے اعمال اس کے بہن بھائیوں اور دوسرے اقارب کے لیے باعثِ صلاح اور باعثِ قیام ثابت ہو رہے ہیں تو وہ انہیں اور بھی زیادہ پسندیدگی سے دیکھتا ہے۔ مذیت کا یہ دوسرا بلند تر درجہ ہے۔

اور اس دوسرے مقام پر کنارِ مادر نے اُسے یہ درس دیا ہے کہ جو پلے لٹا دے اور پھر خوش ہو۔ صبح و شام کی محنتِ شاقہ اور میدانِ جنگ میں خون کے چھینٹے ان سب میں خوشی کے چشمے اُبل رہے ہیں۔ مسٹر چرچل برطانیہ کے وزیر اعظم نے ابھی کل ہی کہا کہ ہم اپنے بچوں کے لیے لڑ رہے ہیں۔ حفظِ نفس کی اسی خواہش بلکہ ضرورت نے اعمال کی لمبی تاریخ مرتب کر دی۔ اور وہ قبیلہ، ملک اور قوم کے مدارج تک آ پہنچی۔ قرآن نے اسے ملک اور قوم کی حدود سے اچھالا اور وہ انسانیت کی بیکرانیوں سے ہمکنار ہو گئی[1]۔

---

[1] فاضل مقالہ نگار کے بیان سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ حفظِ نفس اور حفظِ نوع کا جذبہ جو حیوان اور انسان کی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے وہی قانونِ صلاح و فساد کا مبدأ ہے اور قرآن نے اسی پر اپنے اخلاقیات کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر ان کا خیال یہی ہے تو یہ کسی طرح صحیح نہیں۔ یہ دراصل مغربی اہلِ فکر کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ انسان کو حیوان سے ——— (باقی حاشیہ ص ۷۲ پر)

ہر فعل جس کا رخ انسانی صلاح و فلاح کی طرف ہو وہ اچھا ہے، خیر اور نیکی ہے، اور یہی حقیقی خوشی

(حاشیہ ص۸۱) زائد کچھ نہیں سمجھتے اور اسی لیے انسان کے مذہب عمل کے مبادی حیوانی زندگی کے قوانین میں تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ انسان من حیث الانسان ہرگز حیوان نہیں ہے۔ اس کو آلہ اور سواری کے طور پر حیوانی جسم ضرور دیا گیا ہے لیکن وہ بجائے خود حیوان نہیں۔ اگر وہ حیوان ہوتا تو سرے سے اخلاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اخلاق کا سوال صرف اختیار (Freewill) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ حیوان، جماد، نبات وغیرہ ذی اختیار مخلوق نہیں ہیں بلکہ قوانین طبیعی سے کلیتہً مقہور ہیں اور ان کا بناؤ اور بگاڑ ایسی قوتوں کے عمل سے ہو رہا ہے جن میں وہ اپنا آزادانہ انتخاب کہیں استعمال نہیں کر سکتے، اس لیے وہ اخلاقی وجود نہیں ہیں۔ برعکس اس کے انسان کو ایک خاص حد کے اندر اختیار دیا گیا ہے اور اس کے صلاح و فساد کا سررشتہ تمام تر طبیعت کی جابر قوتوں ہی کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک اس کے اپنے آزادانہ انتخاب پر منحصر ہے، اس لیے وہ ایک اخلاقی وجود ہے اور اس بنا پر اس کی حیثیت تمام مخلوقات سے بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ قرآن سب سے پہلے انسان کی اسی امتیازی حیثیت کو نمایاں کرتا ہے پھر وہ انسان کو بتاتا ہے کہ تیری فلاح اور تیرا خسران، تیرا بننا اور بگڑنا منحصر ہے اس پر کہ تو اپنے اس اختیار کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ انسانی سعی کے دو راستوں کو واضح اور روشن فرق کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ایک یہ کہ آدمی اپنی مختاری سے دھوکا کھا کر اپنے آپ کو خود مختار و غیر ذمہ دار سمجھ لے اور اپنی حیوانی جبلت کو اپنا پیشوا و رہنما بنا کر اس کے پیچھے چلنے لگے۔ اور محض قوانینِ طبیعی (Physical laws) ہی سے اپنی زندگی کا ضابطہ اخذ کر کے صرف اس دنیا کی کامیابیوں کے لیے اپنی مساعی وقف کر دے۔ یہ روش چونکہ فطرتِ کائنات اور فطرتِ انسانی دونوں کے خلاف ہے، نہ اس کائنات کا انتظام اس طور پر بنا ہے کہ یہاں کسی کو خود مختاری کا حق ہو اور نہ انسان کی فطرت اس طور پر بنی ہے کہ وہ نرا حیوان بن کر محض قوانینِ طبیعی پر چلے، اس لیے اس کا آخری نتیجہ فساد ہے، بگڑنا اور ٹوٹ جانا ہے، تباہی و خسران ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات کے حکمران اور خود اپنے صانع کو اپنا حکمران سمجھے، اور اس کے دیئے ہوئے اخلاقی قانون (Moral laws) کی پیروی کرے اور اس کے سامنے اپنی جوابدہی کا خیال رکھ کر اس کی رضا کے لیے سعی کرے۔ یہ روش چونکہ فطرتِ کائنات اور فطرتِ انسانی کے مطابق ہے اس لیے اس کا آخری نتیجہ صلاح ہے، بننا اور ترقی کرنا ہے

(باقی ص۸۳ پر)

کا باعث بھی ہے۔ اور ہر وہ فعل جس کا رُخ تعمیر کی بجائے تخریب، قیامِ حیات کی بجائے فنا اور صلاح کی بجائے فساد کی طرف ہو جائے وہ بُرا ہے، بدی اور شر ہے اور وہی باعثِ غم بھی ہے [۱]۔

انسان کے تجربات کی بہت لمبی فہرست اس زمین کے کونوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن کہتا ہے، کہ انسان اس لمبی زندگی میں ہر فعل کو آزما چکا ہے۔ ہر لغزش کی سزا اور ہر استواری کا انعام حاصل کر چکا ہے۔ پھر ان وارداتِ حیات کو آنکھ کھول کر دیکھو اور پھر انہی زلات کا ارتکاب نہ کرو۔ **قرآن کا عمرانی پیغام وسیع معنوں میں تاریخی استنباط کا پیغام ہے [۲]۔**

انسان کی رہنمائی کا سارا بوجھ اس کی اپنی فطرت پر ہے۔ یہ تو ہوتا رہا کہ انسان نے ہر لغزش پر بہت بڑی انفرادی اور اجتماعی عقوبتیں برداشت کیں۔ مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ نوعِ انسان کا پورا کاروانِ حیات کسی لغزش کی ایسی گھاٹی میں کھو جاتا کہ مٹ جاتا۔ اس کی زندگی راہ کے پیچ و خم کو طے کرتی ہوئی برابر بڑھتی آ رہی ہے اور ارتقائی منازل کا عزم کیے ہوئے ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ تمہیں بتا دیں کہ خوشی کا مسکن کہاں ہے۔ تم اُسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اُن اعمال کا نتیجہ ہے جو موجبِ صلاح ہوں۔ اُن کو معلوم کر لو، اُسے پا لو گے۔ ان اعمال کو انسان کے خود اپنے تجربات کی تائید حاصل ہے۔ نیکی انسان کا داخلی اور موضوعی رجحان ہے، یہ کوئی معروضی حیثیت کی چیز نہیں کہ تمہیں اس کی تلاش کے لیے کہیں باہر سفر کرنا پڑے۔

قرآن انسان کی فطرت کو کامل اعتماد اور بھروسے کی نظر سے دیکھتا ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲) فوز اور فلاح ہے۔ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۙ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۙ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۭ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۭ (ترجمان القرآن)

[۱] ترجمان القرآن۔ یہ بات اصل حقیقت کے برعکس ہے۔ دراصل خیر وہ ہے جو انسان کے بنانے والے کے منشاء کے مطابق ہو اور اس کا نتیجہ صلاح ہے۔ اور شر وہ ہے جو اس کے منشاء کے خلاف ہو اور اس کا نتیجہ فساد ہے۔

[۲] ترجمان القرآن۔ اس بیان میں بھی غلطی ہے اور اس کو ہم نے آگے ایک دوسرے حاشیہ میں واضح کر دیا ہے۔

لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم - ۳۰)

"پھر تو یکسو ہو کر اپنے آپ کو دین پر جما دے۔ اللہ کی فطرت (ساخت) پر قائم ہو جائے جس پر اُس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں یہی سیدھی روش ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

دیگر مطالب سے کٹ کر صرف اِس مقام کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآنِ حکیم امورِ ذیل کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے:

(۱) ایک مقرر دین (راہ) پر آ جاؤ۔

(۲) وہی ایک راہ ہے جو انسان کی فطرت کی راہ ہے۔ انسان جا ہی اسی پر سکتا ہے۔ یہ اس لیے کہ دائیں بائیں متوجہ ہونا اس کے لیے باعثِ ہلاکت ثابت ہُوا، ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔[1]

[1] ترجمان القرآن۔ فاضل مضمون نگار نے یہاں استدلال کا رُخ اُلٹا پھیر دیا ہے۔ ان کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی راہ ایک ہی صحیح ممکن العمل راہ اس وجہ سے ہے کہ دائیں بائیں متوجہ ہونا تجربے سے مہلک ثابت ہُوا حالانکہ دراصل یہ اس راہ کے صحیح ہونے کی وجہ نہیں ہے بلکہ انسان کے ہلاکت میں مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس راہ سے ہٹتا۔ فاضل موصوف کے طرزِ بیان سے آدمی کو یہ غلط فہمی لاحق ہو سکتی ہے کہ "قرآن نے اس راہ کو انسان کے تاریخی تجربات سے اخذ کیا ہے یعنی ہزارہا برس کے تجربات سے معلوم ہُوا کہ انسان جب کبھی اس طرف یا اُس طرف ہٹا، ہلاک ہو گیا، لہٰذا اس علم کی روشنی میں اس نے دونوں طرفوں کے درمیان ایک بیچ کی راہ نکال لی جو سیدھی اور صحیح ہے اس لیے کہ تاریخ کا تجربہ اس کو ایسا ہی ثابت کرتا ہے" حالانکہ قرآن کا علم تجربات و مشاہدات سے اخذ کیا ہُوا علم نہیں ہے علم کی یہ نوعیت انسان کے لیے خاص ہے۔ قرآن کے مصنف، خداوندِ برتر کے علم کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ اس نے تو انسان کو خود بنایا ہے۔ وہ اپنی ساخت کو اور اس کے مزاج کو بذاتِ خود جانتا ہے۔ اسی ذاتی علم کی بنا پر وہ صانع کمے سے تحکّم کے ساتھ کہتا ہے کہ تو اس فطرت پر بنایا گیا ہے اور تیرے لیے یہ راہ صحیح ہے رہے وہ شواہد جو قرآن میں انسانی تاریخ سے پیش کیے گئے ہیں تو وہ اس حیثیت سے نہیں ہیں کہ یہ وہ مواد ہے جس سے دینِ قیّم کا استنباط کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کے پیش کرنے کا مدعا انسان کو یہ بتانا ہے کہ تو خود اپنے تجربات کی کسوٹی پر

(باقی ص ۶۵ پر)

(۳) اسی پر انسان کی فطرت کو تعمیر کیا۔ یہ سیدھی راہ ہے۔ اُس کی ساخت کو ادھورا نہیں چھوڑا کہ وہ کسی معروضی یا باہر کی ہدایت کا امیدوار رہے[1]۔ اسی پر چلتے جانا بھلائی ہے۔

(۴) یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تم میں سے اکثر واقف نہیں۔

اسی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "الفطرۃ" کہا:۔

مامن مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ

"ہر پیدا ہونے والا اسی ایک فطرۃ پر پیدا کیا جاتا ہے۔ جس پر اس کی ہدایت کا پورا بوجھ رکھا جاتا ہے۔ یہ پھر تم ہو کہ اُسے مختلف نام دے دیتے ہو[2]"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۴) اس راہ کو پرکھ کر دیکھ لے، جب تو اس پر چلا تیری زندگی کی کل سیدھی چلی اور جب کبھی تو اس سے ہٹا وہ بگڑ گئی۔ آگے چل کر متعدد مقامات پر اس مضمون میں ایسے فقرے ملتے ہیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ قرآن اور نبی صرف تجربات سے حاصل شدہ علم کو پیش کرتے ہیں۔ ان تمام مقامات کی تصحیح کے لیے یہ تنبیہہ کافی ہے۔

[1] ترجمان القرآن۔ یہ الفاظ پھر غلط فہمی پیدا کرنے والے ہیں۔ انسان کی فطرت میں اس کے خالق نے فجور اور تقویٰ کا وجدانی علم ضرور رکھدیا ہے، دونوں راہوں کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کی استعداد ضرور ودیعت کی ہے، مگر حتمی و قطعی طور پر یہ جاننا کہ یہی تقویٰ کی راہ ہے، یہی مقتضائے فطرت ہے، اور اسی میں خیر و صلاح ہے، تنہا انسانی فطرت کے بس کی بات نہیں ہے۔ انسان یہاں اپنے صانع کی طرف سے رہنمائی کا محتاج ہے۔ اس کی طرف سے جلی اور روشن رہنمائی کے بغیر وہ محض اپنی فطرت کی رہبری میں اس راہ کا خود انکشاف نہیں کر سکتا۔ البتہ جب وہ راہ پیش کر دی جائے تو فجور و تقویٰ کا وہ وجدانی علم جو اس کی فطرت میں موجود ہے، اُس راہ کو خود اپنی گم شدہ چیز کو پہچاننے میں مدد ضرور دے سکتا ہے، بشرطیکہ اکتسابی علوم کی گرفتاری اور تعصبات و رجحانات نفس کی غلط افتاد نے اس وجدان کو مسخ نہ کر دیا ہو۔

[2] ترجمان القرآن۔ پہلا فقرہ ارشادِ نبوی کے مطابق ہے، مگر بعد کے دونوں فقرے خود قائل (صلعم) کے مدعا سے بہت دُور ہٹ گئے ہیں۔ حضورؐ نے نہ اس حدیث میں یہ فرمایا ہے اور نہ کبھی کسی موقع پر آپ نے ایسا کہا کہ ہر انسان کی اپنی فطرت ہی پر اس کی ہدایت کا پورا بوجھ رکھ دیا گیا ہے۔ اگر بات یہی ہوتی تو خدا کی طرف سے (باقی ص۷۶ پر)

(۵) یہی فطرت جس کے سہارے انسان زندگی کے لمبے سفر کو طے کرنے نکلا ہے یہ الدین القیم ہے۔ ایسی راہ ہے جو تمہیں قائم رکھتی ہے مٹنے سے بچاتی ہے۔ ہلاکت سے بچاتی ہے اور قیام کی ضامن ہے۔ انسان کس کے سہارے چلتا ہے؟ فطرت کے۔ فطرت کا طریق کار یا مذہب عمل کیا ہے؟ اصلاح و تعمیر۔ وہ الدین القیم ہے۔ تمہاری زندگی کو قائم رکھنے والی راہ۔
قرآن ہمیں اپنے عمرانی پیغام کی صحیح معرفت عطا کرنے کے لیے ہماری حیات کے ارضی تجربات کو ہمارے سامنے پھیلاتا ہے۔ اور صرف ان اعمال کو جنہیں ہم نے خود دیکھا کہ وہ ہمیں گھاٹے میں رکھتے چلے آئے ہیں وہ بدی کہتا ہے۔ ان کے برعکس وہ اعمال جو ہماری آنکھوں نے خود دیکھے کہ وہ آج تک اصلاح کا باعث بنتے چلے آئے ہیں، انہیں وہ نیکی یا بھلائی کہتا ہے۔ ہماری حیات ارضی کے لیے انہیں بہتر بتاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم روزمرہ کے معاملات میں (۱) سچائی (۲) فیصلہ کی پختگی (۳) اطاعت رسول اور اطاعت الٰہی کو اختیار کرو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۵) الگ مستقل ہادی آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ رہا تیسرا فقرہ تو وہ بھی حدیث کے مفہوم سے پوری طرح مطابق نہیں ہے۔ حضورؐ کا مدعا دراصل یہ تھا کہ ہر بچہ اس صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے جس پر اللہ نے انسان کو بنایا ہے لیکن جس سوسائٹی میں وہ آنکھیں کھولتا ہے وہ اگر فطرت کی راہ سے ہٹی ہوئی ہو تو وہ اس بچے کو بھی اپنی غلط راہ پر لگا لیتی ہے۔

ملہ ترجمان القرآن۔ عربی زبان میں قیام کا اصل مفہوم راستی (کجی کی ضد) ہے۔ دینِ قیم وہ راہ ہے جو خود سیدھی اور مستقیم ہے، اور جو اپنے راہرو کی زندگی کو راستی پر قائم رکھنے والی اور کجی سے بچانے والی ہے۔ مٹنے اور ہلاک ہونے سے بچنا اس راستی و راست روی کا نتیجہ ضرور ہے اگرچہ فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے۔ عموماً مغربی نظریات کے اثر سے بقاء (Survival) اور تسلسلِ حیات (Continued existence) کی اہمیت لوگوں کی نگاہوں میں زیادہ ہو گئی ہے، اس لیے وہ "دینِ قیم" کے لفظ میں جب قیام کا مادہ دیکھتے ہیں تو خواہ مخواہ ان کا ذہن بقاء اور تسلسلِ حیات ہی کے مفہوم کی طرف چلا جاتا ہے۔

کیوں؟ اس لیے کہ صرف یہی اعمال (۱) تمہارے روزمرہ کے معاملات میں اصلاح اور بناؤ پیدا کر سکتے ہیں (۲) تم سے تمہاری بدیوں کو کاٹ کر الگ کر سکتے ہیں (۳) تمہیں کامیاب زندگی عطا کریں گے۔

اب ان مقامات کو سامنے رکھ کر سورۂ احزاب پڑھو:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ (احزاب - ۶۸،۶۷)

حق شناس آنکھیں رکھتے ہو تو دیکھو اطاعتِ خدا اور رسول کو بھی کسی معروضی حُسن (Objectivity) کے لیے قبول کر لینے کو نہیں کہا۔ بلکہ کہا تو یہ کہا کہ تم دیکھ چکے ہو کہ یہ تمہاری اصلاح کا باعث ہے[1]۔

قرآن کہتا ہے:-

آپس میں نہ جھگڑو۔ اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی معروضی بدی ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ایسا کرنے سے انسان کی زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس میں فساد اور ہلاکت آجاتی ہے۔ مٹنے والوں کے آثارِ باقیات سے پوچھ لو کہ ایسا کرنے سے تمہاری طاقت سست پڑ جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

اس کے بجائے تم یہ کرو کہ

(۱) اللہ اور اس کے رسول کے اطاعت گزار بن جاؤ۔

(۲) صبر کرو۔ یعنی مصائب کے مقابلہ میں عزم کے ساتھ کھڑے رہو اس لیے کہ بالآخر جیت اسی کی ہوگی جو زیادہ مشکلات جھیلنے والا ہوگا۔

اور یہ چیزیں کوئی نئی نہیں۔ انسان نے ان کو خود عملاً دریافت کیا ہے۔ یہ اس کے اپنے دل کی آوازیں ہیں۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (الانفال - ۴۵)

---

[1] ترجمان القرآن۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اطاعتِ خدا اور رسول اس لیے کرو کہ تجربہ سے اس کا موجبِ صلاح ہونا ثابت ہوا ہے بلکہ اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ایسا کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال کو درست کر دیگا اور تمہیں کامیابی عطا کریگا۔

(۱) جو لوگ اللہ کے سامنے اس طرح کھڑے ہوتے ہیں جیسے وہ ایک باجلال بادشاہ کے حضور ہوں
(۲) جو لوگ ہر نکمی بات سے بچتے ہیں،
(۳) اپنی کمائی سے محتاجوں کو دیتے ہیں،
(۴) زنا سے الگ ہوتے ہیں،
(۵) امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں،
(۶) وعدہ کے پکے ہوتے ہیں،

اُن کے کاموں میں بگاڑ یا فساد رہ نہیں پاتے۔ انسان کی ہر بستی کی یہ ایک آزمائی ہوئی حقیقت ہے۔ ایسے لوگ آج تک فلاح پا چکے ہیں اور آیندہ پاتے رہیں گے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ o اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ o (المومنون - ا تا ۶)

قَدْ اَفْلَحَ، ماضی کا صیغہ یہاں خاص لطف دے رہا ہے۔

قرآن انسان کو اس کی لمبی سرگزشت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ تم سے پوچھتا ہے کہ کیا تم زمین کے احوال کو گھوم کر مشاہدہ نہیں کرتے؟ اپنے پچھلوں کے باقیات کو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے؟ مٹنے والوں کے کھنڈروں سے جو صدائیں بلند ہو رہی ہیں کیا وہ تمہارے کانوں تک نہیں پہنچتیں؟ تمہارے سینوں کے اندر دل تو صرف اس لیے دیئے گئے تھے کہ تم اُن سے درس و عبرت کے خزانے جمع کر لیتے۔ اُن کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے۔ جس نوع کے اعمال اُن کے لیے اصلاح کا باعث ہوئے، انہیں اختیار کر لیتے۔ جو انہیں ہلاکت کی طرف لے گئے اُن سے بچ جاتے۔ وہ اگر اپنی کوتاہیوں کی نذر ہو گئے تو تم اُن سے عبرت حاصل کرتے۔ دیکھو تم بھی اُن کی طرح خرابی کی آزمائی ہوئی راہوں کو نہ آزماؤ۔ تمہارے آباء کی داستانِ حیات صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ پھر کیا تمہارے دل و دماغ نہیں کہ تم پھر انہی ہلاکتوں کو آزمانے جا رہے ہو۔ بس سمجھ جاؤ اور اُن شاہراہوں کی طرف بڑھو جو تمہارے لیے بہتر

اور نفع رساں ہیں۔

یاد رکھو! یہ وہ نتائج ہیں جنہیں تمہارے اجداد نے کئی ہزار برس میں مرتب کیا۔ وہ بھی کوئی تھوڑے دنوں کی فرصت میں ان نتائج پر نہیں پہنچے تھے۔ تمہاری گنتی کے ایک ہزار سال انسان کی مجموعی زندگی کے ارتقاء میں ایک دن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر جو مجموعی نتائج انسان نے اس کاوش سے مرتب کیے ہیں تم اُن سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔

یہ نہ سمجھو کہ آج سے ایک ہزار سال پہلے کے انسان سے تمہارا کوئی رابطہ نہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں تک انسانی حیات کی تعمیر اور انسانی فطرت کی رفتار کا تعلق ہے وہ ایک ہزار سال تو ایک دن کے مانند ہیں۔ یعنی اس کے ڈانڈے تمہاری زندگی سے، اور تمہاری زندگی سے ایک ہزار سال قبل و بعد کے انسان کی زندگی سے اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے آج کا دن آنے والے اور گزرے ہوتے کل سے ملا ہوا ہے۔ پھر جیسے پیر کے نتائج سے منگل اور منگل کے نتائج سے جمعرات الگ نہیں اسی طرح تم انسانیت کے ماضی اور مستقبل کے درمیان کی ایک کڑی ہو۔ پھر کیا تمہارے پہلو میں دل نہیں کہ تم عبرت کے ذخائر جمع نہیں کر لیتے؟

شاید تمہارے کان نہیں کہ تم نہیں سنتے۔ تمہارے پاؤں نہیں کہ تم زمین کے گوشوں میں سفر کو نکلتے اور اپنے لیے ان اعمال کی جو آغازِ آفرینش سے حیاتِ انسانیہ کی اصلاح کرتے چلے آئے ہیں، اور اُن کی جو روزِ اوّل سے حیاتِ ارضی میں فساد پیدا کرتے چلے آئے ہیں، اپنی رہنمائی کے لیے ایک فہرست بنا لیتے۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۚ وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۝ (الحج - ۴۵، ۴۶)

٭ کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل اس قابل ہو جاتے کہ سمجھیں بوجھیں۔

یا کان ہی کھل جاتے کہ حقیقت کی ترجمانی کرنے والے کی بات سنیں۔ دراصل آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جایا کرتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں۔ یہ لوگ تم سے عذاب کے مطالبے میں جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدہ کے خلاف نہ کرے گا مگر تیرے پروردگار کے ہاں ایک دن کی مقدار ایسی ہے جیسے تم لوگوں کی گنتی میں ایک ہزار برس"

اگر تم یہ عبرت اندوزی کی خواہش لے کر اپنے ماضی کے پاس جاؤ تو دیکھو گے کہ نسل انسانی کو نبیوں کی دعوت سے ہمیشہ فائدہ ہی پہنچا۔ انہوں نے ہمیشہ تمہاری مُردہ روحوں کو زندہ کیا۔ پھر تم بھی ان کی دعوت سے زندگی حاصل کرو۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ۚ (الانفال-۲۴)

"ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جبکہ وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف بلاتے جو تم کو زندگی بخشنے والی ہے"

جھٹلانے والے انہیں ہر عہد میں جھٹلاتے رہے۔ مگر ان کا انجام کیا ہوا؟ ہولناک نتائج نے انہیں آلیا اور وہ تمہارے لیے دردناک داستانیں چھوڑ گئے۔ تم ان کی ٹوہ میں نکلو۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ۝ (آل عمران - ۱۳۶)

ایمان و تقویٰ (الانفال - ۲۸)، فی سبیل اللہ خرچ کرنا (الانفال - ۶۰) عہد و پیمان کی پختگی (الانفال کی آخری آیات) ہدایتِ الٰہی کی پیروی (طٰہٰ - ۲۰) ان افعال کو تمہارے پچھلوں نے اپنی زندگی کے سفر میں آزما دیکھا ہے کہ یہ باعث اصلاح ثابت ہوتے رہے۔ ان کے برعکس جو اعمال کسی زمانے میں بھی تمہاری اصلاح نہ کر سکے بلکہ فساد کا موجب بنے وہ یہ ہیں :۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا ۝ (الکہف ۱۰۴ تا ۱۰۵)

وہ ان سے کہو ہم تمہیں بتائیں کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہیں؟ وہ جن کی

ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کام بنا رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کے احکام و ہدایات کو نہ مانا اور اس سے انکار کیا کہ انہیں ایک روز اس کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ اس لیے ان کے سارے کام اکارت گئے۔ اور اس لیے قیامت کے دن ہم ان کے اعمال کو کوئی وزن نہ دیں گے۔"

رسول کی ہستی اس سے زیادہ نہیں کہ وہ تمہیں زندگی کی ان آزمائی ہوئی راہوں سے آگاہ کرنے والا ایک انسان ہوتا ہے[1]۔ تم پر داروغہ نہیں ہوتا۔ تمہیں جبراً کسی راہ پر لانے کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ وہ اچنبھے اور عجائب کاریاں لے کر تمہارے پاس نہیں آتا۔ وہ تمہاری طرح بازاروں میں لین دین کرتا ہے۔ وہ تمہارا کفارہ ہو کر نہیں آتا۔ تم اُس کی باتوں کو ہنسی میں اُڑا دو، تم اُس کی ہدایت کو قبول نہ کرو۔ وہ تمہارے قلوب، آنکھوں اور کانوں پر کوئی قبضہ نہیں رکھتا کہ بہروں کو سنا دے اور اندھوں کو دکھا دے۔ یہ اُس کے بس کی باتیں نہیں نہ یہ کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ تمہاری طرح وہ بھی صرف اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ لِي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۖ أَنْتُمْ بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ ۝ وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ۝ (یونس ۱۰ : ۴۱ تا ۴۳)

ان تجربات کو قرآن "نور" بھی کہتا ہے۔ دیکھو گے تو ان کی روشنی میں تمہاری زندگی کا ہر پہلو واضح

---

[1] ترجمان القرآن: رسول کے منصب کی یہ تعبیر صحیح نہیں۔ وہ مؤرخ یا محقق انسانیات (Anthropologist) نہیں ہوتا جس کا کام انسان پر گزری ہوئی کیفیات کا جائزہ لینا اور لوگوں کو پچھلی نسلوں کی آزمائی ہوئی راہوں سے آگاہ کر دینا ہو۔ اس کا علم تجربات و مشاہدات سے اخذ کیا ہوا علم نہیں ہوتا بلکہ حقیقت کا علم ذاتی جو خالقِ کائنات کے پاس ہے وہ وحی کے ذریعہ سے براہِ راست اُس کے پاس آتا ہے۔ اور چونکہ وہ حقیقت واقعہ کا علم ہوتا ہے اس لیے انسانی تجربات کی شہادت اس کی تائید کرتی ہے۔

ہو جائے گا۔ انسان جو جہل و جذبات کے حالات سے ٹکراتا آگے بڑھ رہا ہے اور یہ اس کے اپنے مرتب کردہ اصلاح کے اصول ہیں[1]۔ وہ کہتا ہے کہ اس زمین کی وراثت ان مصلحین کے لیے وقف ہے جو ان اصول کو پیش نظر رکھ کر زندگی کے سفر کو نکلیں اور یہ حقیقت صرف تمہارے لیے نہیں بلکہ زبور میں بھی ہم نے یہی کہا تھا یعنی یہ بہت پرانی حقیقت ہے۔ (الانبیاء-۱۰۴)

قرآن جب کسی برباد ہونے والی بستی یا قوم کا ذکر کرتا ہے تو ہر موقع پر یہ حقیقت دہرا دیتا ہے کہ ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے یعنی یہ جو اس بستی کو سزا دی گئی یہ کوئی معروضی واقعہ نہ تھا بلکہ انہوں نے خود ظلم کیا (سورہ توبہ-۶۹)۔ یہ اُن کے اندر کے اعمال تھے۔ یہ ایک موضوعی واقعہ تھا۔

اپیکیورس نے خوشی کو ڈھونڈا بینتھم نے خوشی کی بہتات (Quantity) کی آرزو کی۔ جان اسٹوارٹ مل نے بہتر خوشی (Quality) پر زور دیا۔ مگر کوئی بھی اس طرف نہ گیا کہ ان افعال کو تلاش کیا جائے جو خوشی پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ ہو سکتا کہ درخت کا تنا تو نہ ہو مگر اس کے ہرے بھرے پتے پھوٹ رہے ہوں تو مجرد خوشی کو تلاش کرنے والے ناکام نہ رہتے۔ غم اور خوشی تو تاثرات ہیں جو مختلف افعال کے نتائج ہوا کرتے ہیں۔

ایک کو یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانات میں کامیاب ہو کر خوشی ملتی ہے۔ ایک کو شراب کے جرعات میں۔ دونوں خوش ہیں۔ اب ایک تیسرا شخص جوان کو دیکھ رہا ہے چاہتا ہے کہ اُسے بھی خوشی حاصل ہو مگر وہ نہ تو امتحانات میں بیٹھنا چاہتا ہے اور نہ شراب کو خریدنے کے لیے دام رکھتا ہے۔ تو بتاؤ کیا خوشی کا حصول اس کے لیے ممکن ہے؟ خوشی تو محض ایک نتیجہ تھی۔ پس تم کہو گے کہ وہ صحیح سوچ نہ سکا۔ خوشی کے متلاشیوں کے لیے صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ وہ ایسے درخت کی جستجو کرتے جس کی ٹہنیوں میں

---

[1] ترجمان القرآن۔ قرآن ان تجربات کو نور نہیں کہتا بلکہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی دانش و ہدایت کو نور کہتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ اصلاح کے جو اصول قرآن پیش کر رہا ہے وہ انسان کے اپنے مرتب کردہ ہیں۔ تاریخ اور انسانیات کے مطالعہ و تحقیق سے معلومات کا جتنا ذخیرہ آج تک فراہم ہوا ہے وہ سب کا سب سامنے رکھ کر بھی انسان اپنی فلاح و سعادت کے صحیح اصول خود مرتب نہ کر سکا۔

خوشی کے پھول آتے ہوں۔ مگر وہ اُلجھے رہے اور اس حقیقت کو نہ پا سکے۔

اب تم دیکھ چکے ہو کہ خوشی صرف اُن افعال سے پیدا ہوتی ہے جو حیاتِ انسانیہ کے لیے آج تک بناؤ سنگھار کا ذریعہ ثابت ہوتے رہے ہیں۔ باعثِ صلاح رہے ہیں، جن میں تباہی اور فساد کا اصلاً کوئی امکان نہیں، چنانچہ

۱۔ قرآن ماضی کو سامنے رکھتا ہے۔

۲۔ تمہارے لیے ماضی نے جن امور کو باعثِ صلاح پایا انہیں شمار کرتا ہے۔ اور تمہیں اگر تم انہیں اختیار کر لو تو ایک دائمی کامرانی کی بشارت دیتا ہے۔ زمین کو تمہاری وراثت بتاتا ہے۔ نبی کو وہ اسی لیے بشیر کہتا ہے اس لیے کہ وہ بشارت دیتا ہے۔ ان الارض یرثہا عبادی الصالحون (الانبیاء ۱۰۴)

۳۔ اور وہ افعال جنہیں تم دیکھ چکے ہو کہ وہ مفاسد ہیں ان سے تمہیں خبردار رہنے کے لیے کہتا ہے۔ تمہیں ان کے سو بار آزمائے ہوئے انجاموں سے ڈراتا ہے۔ نبی کو وہ اسی لیے نذیر کہتا ہے اس لیے کہ وہ ڈراتا ہے۔

۴۔ مقصود یہ کہ قرآن خود انسان کی فطرت کو اس کا رہنما بتاتا ہے۔ وہ اپنی اندرونی ہدایت سے زندگی کے سفر کو نکلا ہے۔

۵۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ انسان خوشی کی تلاش نہیں کرتا بلکہ اپنے قیام و صلاح کا طلبگار ہے۔ خوشی اگر فساد و ہلاکت کا باعث ہو تو وہ اسے اختیار نہیں کرتا۔

کانٹ اس طائفہ (Epicureanism) کے مرض کے صحیح مقام پر انگلی نہ رکھ سکا۔ وہ یہ نہ سمجھا کہ اس پر پھاہا کہاں رکھا جا سکتا ہے، فکر کی غلطی کیا ہے اور اُس کی صحت کیسے کی جا سکتی ہے، لہٰذا وہ ایک دوسرے گوشے میں نکل گیا۔ وہ انسان کی فطرت کو مایوسی سے دیکھتا ہے۔ اس نے انسان سے الگ نیکی کا ایک نظام نامہ مرتب کیا اور انسان کو کہا کہ وہ اُسے قبول کر لے۔ اس نیکی کے معروضی نظریہ کی صحیح معرفت کے لیے تم ایک اندھے کو تصور کرو جو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں کر سکتا اور ایک بچے کی انگلی پکڑے بازار کی بھیڑ سے گزر رہا ہے۔ اسی طرح یہ معروضی مصلین انسانی فطرت پر اعتماد

نہیں رکھتے ۔ وہ انسان کے اندھے ہاتھوں میں اپنا نظام نامہ دے کر اُسے زندگی کی تاریکیوں سے گزارنا چاہتے ہیں۔

غور کرو جب انسان فطرتاً اندھا ہے تو اس کی رہنمائی کیسی ؟ تم نے کسی اندھے کو نہیں دیکھا کہ وہ بچہ جو لاٹھی تھامے اس کے ساتھ جاتا تھا وہ دن کے چوبیس گھنٹے اور گھنٹے کے ساٹھ منٹ اور منٹ کے ساٹھ سیکنڈ اس کے ساتھ رہ سکتا ہو۔ پھر اور دیکھو آگ فطرتاً جلاتی ہے ۔ تم اُسے جلانے سے روک نہیں سکتے ۔ انسان اگر فطرتاً اندھا ہے تو تم کون ہو کر اسے نظام نامہ کی لاٹھی دے کر اس کی فطری کوری کو دُور کر سکو۔

نیکی کا یہ معروضی یا خارجی تخیل تھا۔ ظاہر ہے یہ استدلال کے مطالبات کا ساتھ نہیں دیتا۔

سُنّتِ رسولؐ

(شیخ مُصطفیٰ السباعی)

صحابہ کا سفر برائے حدیث شیخین کے آخری وقت تک حدیث صحابہ کرام کے سینوں میں ہی محفوظ رہی، اس وقت تک اس کی اشاعت باہر کے ملکوں میں بہت زیادہ نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ صحابہ کرام کو بغیر کسی شدید مصلحت کے مدینہ منورہ سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے مدینہ منورہ کے اندر بھی اسے اچھی طرح فروغ حاصل نہ ہو سکا کیونکہ حضرت عمرؓ کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ قرآن پر زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کی جائے اور روایت کم سے کم کی جائے تاکہ لوگ اس میں زیادتی نہ کرنے لگیں اور اس کا سلسلہ خطا اور وہم دونوں سے پاک رہے۔

لیکن جب حضرت عثمانؓ کا دورِ خلافت آیا تو انہوں نے صحابہ کو مدینہ منورہ سے باہر جانے کی اجازت دے دی، اور چونکہ اجلّہ صحابہ کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی تھی اور عام مسلمانوں کو دین سیکھنے کے لیے صحابہ کی شدید ضرورت تھی، بالخصوص کم پایہ صحابہ کو، اس لیے مؤخر الذکر صحابہؓ اسی ضرورت کے پیشِ نظر اوّل الذکر سے حدیثیں جمع کرنے کی مہم میں مصروف ہو گئے، اور اسی مہم کے سلسلہ کی ایک کڑی صحابہ کا سفر برائے حدیث بھی ہے۔ امام بخاریؒ، احمدؒ، طبرانیؒ اور بیہقیؒ نے جابرؓ بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ "مجھ تک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ایک صحابی کے حوالے سے پہنچی، مگر میں نے خود یہ حدیث حضورؐ سے براہِ راست نہیں سنی تھی، لہٰذا میں نے ایک اونٹ خریدا اور اس پر کجاوہ کس کر مسلسل ایک ماہ تک سفر کرتا رہا، یہاں تک کہ منزلِ مقصود یعنی شام پہنچا، یہاں آنے پر معلوم ہوا کہ صحابی عبداللہ بن انیس انصاری ہیں، میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے آپ کے حوالہ سے مظالم کے بارے میں ایک حدیث سنی ہے، مگر چونکہ براہِ راست سننے کا موقع نصیب نہیں ہو سکا تھا ــــ اور موت کا کیا ٹھکانا، اس لیے حاضرِ خدمت ہوا ہوں"

انہوں نے فرمایا :-

"مَیں نے آنحضور کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "لوگ قیامت کے دن ننگے بے سر وسامان اور گونگے جمع کیے جائیں گے . . . . الخ"

اسی طرح بیہقیؒ اور ابن عبدالبرؒ نے عطاء بن ابی رباح سے روایت کی ہے کہ ابوایوبؓ انصاری نے عقبہ بن عامر کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محض ایک حدیث کی خاطر سفر کیا، جب ابوایوبؓ ہاں پہنچے، تو سب سے پہلے مسلمہ بن مخلد انصاری سے ملاقات ہوئی۔ مسلمہ اس وقت مصر کے امیر تھے، انہوں نے بڑھ کر حضرت ابوایوبؓ انصاری سے معانقہ کیا اور فرمایا کہ کیونکر آنا ہوا؟ ابوایوبؓ انصاری نے جواب دیا کہ "ایک حدیث کی جستجو میں، جو ستر مومن سے متعلق ہے" مسلمہ نے کہا کہ جی ہاں، مَیں نے آنحضورؐ کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ "من ستر مومنا فی الدنیا علی کربته، ستره الله یوم القیامة" (جس شخص نے کسی مومن کی پردہ پوشی دنیا میں کی، اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کے دن پردہ پوشی کریگا)۔ یہ حدیث سننے کے بعد حضرت ابوایوبؓ فوراً اپنی سواری پر سوار ہوتے اور مدینہ منورہ کا رُخ کیا اور اس شان بے نیازی کے ساتھ کہ جو تحفہ مسلمہ نے ان کی خدمت میں بھیجا تھا، وہ انہیں مصر کے علاقے عرَیش میں ملا۔

اس طرح احادیث کی روایت کو وسعت حاصل ہونے لگی اور لوگوں کی نظریں پہلے سے بدرجہا زیادہ اہتمام کے ساتھ صحابہ کی طرف منعطف ہونے لگیں۔ تابعین میں یہ جذبہ پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا جانے لگا کہ صحابہ سے ملکر، ان کے سینوں کے اندر محفوظ علم کو، ان کی زندگی ہی میں منتقل کر لینا چاہیے۔ اسی جذبہ وشوق کا یہ اثر تھا کہ اس زمانہ میں کسی صحابی کا کسی شہر میں پہنچ جانا اس امر کے لیے کافی ہوتا تھا کہ شہر کے تمام لوگ ان کے اردگرد بھیڑ کی صورت میں جمع ہو جائیں، اور انگلیاں اشارہ کرنے لگیں کہ یہ ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی۔

صحابہ میں سے کچھ لوگ کثرتِ روایت میں مشہور ہیں، یا تو طولِ صحبت کے باعث، مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ، یا آپ کی مسلسل خدمت کے سبب، جیسے انسؓ بن مالک، یا آپ کے نجی حالات سے واقفیت کے سبب، مثلاً عائشہ صدیقہؓ، یا آپ کی حدیث پر زیادہ اہتمام اور توجہ صرف

کرنے کے باعث مثلاً: عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عمروؓ اور ابوہریرہؓ، حالانکہ پہلے دونوں حضرات بہت کم سن تھے اور حضرت ابوہریرہؓ بہت دیر سے ایمان لائے تھے۔ ان حالات میں لوگ صحابہؓ سے بلاکسی شک یا تردد کے حدیثیں سنتے تھے اور خود صحابہ بھی ایک دوسرے سے سنتے اور اسے کوئی قابلِ اعتراض چیز نہ سمجھتے۔ اس زمانہ تک حدیثِ نبوی جعل و تدلیس سے محفوظ تھی اور جھوٹ بولنے والے اور جھوٹی روایتیں گھڑنے والے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ یہ حالت اس وقت تک قائم رہی جب تک فتنے برپا نہیں ہوتے تھے۔ لیکن جس وقت فتنے اُٹھ کھڑے ہوتے تو مسلمانوں کی زندگی کا رُخ ہی بدل گیا اور یہی ان کے سیاسی انحطاط کا نقطۂ آغاز بھی ثابت ہوا۔

موضوع احادیث کی ابتداء | سنہ ۴۰ھ تک احادیث کذب و وضع سے بالکل محفوظ اور پاک و صاف رہیں، لیکن اسی سنہ سے ان میں زیادتی شروع ہوئی اور سیاسی اغراض اور فرقہ بازیوں کے لیے استعمال ہونے لگیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت علیؓ اور معاویہؓ کا اختلاف پُورے شباب پر تھا، اور اس نے ایسی خانہ جنگی کی صورت اختیار کرلی تھی، جس میں لاتعداد نفوس کا خون ہوا، مسلمان مختلف قسم کی فرقہ بندیوں میں مبتلا ہوگئے، سوادِ اعظم حضرت علیؓ کا حامی تھا اور حضرت معاویہؓ سے نالاں تھا، خوارج حضرت علیؓ اور حضرت معاویہ دونوں کو برسرِ غلط سمجھنے لگے تھے، حالانکہ اس سے پہلے وہ کٹر قسم کے تشیع پسند تھے، آلِ بیت کا ایک گروہ حضرت علیؓ کی شہادت اور معاویہؓ کی خلافت کے بعد، استحقاقِ خلافت کا دعویدار بن کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا، اور اموی حکومت کی نافرمانی پہ آمادہ ہو گیا تھا۔ بڑی ہی تلخ اور افسوسناک حقیقت تو یہ ہے کہ اس فرقہ بندی نے دین کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور دین کے اسی غلط تصوّر نے مسلمانوں کے اندر گروہی عصبیت اور تفرقہ کا مرض پیدا کر دیا۔

ہر گروہ یا فرقہ اس کوشش میں مصروف ہو گیا کہ وہ اپنے اختیار کردہ مسلک کی تائید میں قرآن و حدیث سے استدلال کرے، اور یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ قرآن اور حدیث مختلف اور متضاد مسلکوں کی حمایت کریں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام پارٹیوں نے قرآن مجید کو من مانا استعمال کرنا شروع کر دیا اور سنت کو بھی وہ معانی پہنائے جانے لگے، جو قطعاً اس سے جچتے نہیں لگتے تھے۔ اور

اپنی بات منوانے یا دعویٰ کی تائید میں آنحضورؐ کی طرف بالکل جھوٹی باتیں منسوب کی جانے لگیں۔ مگر قرآن ان گروہوں کی دست بُرد سے محفوظ رہا، اس لیے کہ قرآن حفظ اور کثرتِ تلاوت و روایت کے سبب اس طرح کے خطرات و تصرفات سے بالکل مامون ہو چکا تھا۔

غرضیکہ یہیں سے احادیث میں کذب و وضع کا آغاز ہوا اور صحیح حدیثیں موضوع حدیثوں میں خلط ملط ہو گئیں۔ اول اول حدیث وضع کرنے والوں نے جس مضمون کی حدیثیں گھڑیں وہ سب کی سب فضائلِ اشخاص سے متعلق ہیں، ان لوگوں نے اپنے اماموں اور اپنی پارٹیوں کے لیڈروں کی فضیلت و شان میں بے شمار حدیثیں گھڑ ڈالیں۔ اور سب سے پہلے جس گروہ نے اس حرکت کا ارتکاب کیا وہ شیعہ حضرات تھے، ایک شیعی عالم ابن ابی الحدید نے، شرح نہج البلاغہ میں اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :-

"فضائل کی احادیث میں جھوٹ کی ابتداء شیعہ حضرات کی جانب سے کی گئی۔ ۔ ۔ ۔ الخ"

لیکن جاہل اہلِ سنت نے بھی ان کا جواب کذب و افترا ہی سے دیا۔

حدیث میں وضع کا عمل کس پَود سے شروع ہوا

ہمارے لیے یہ تصور کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ صحابہؓ، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جان و مال سے فدا تھے اور جنہوں نے اسلام ہی کے لیے اپنے وطن عزیز اور اقربا کو خیرباد کہہ دیا تھا اور جن کے رگ و ریشہ میں خدا کی محبت اور خوف خون کی طرح سرایت کیا ہوا تھا، وہ آنحضور صلعم پر بہتان طرازی سے کام لیتے، خواہ اس کے اسباب کچھ ہی کیوں نہ ہوں، خصوصًا جبکہ ان کے محبوب نجات دہندہ رسول (صلی اللہ وسلم) کے اس قول کا ان کے اندر عام چرچا تھا: "اِنَّ کَذِبًا عَلَیَّ لَیْسَ کَکَذِبٍ عَلٰی اَحَدٍ، وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ" "مجھ پر بہتان طرازی سے کام لینا، عام آدمی پر بہتان باندھنے سے مختلف ہے، جو شخص قصدًا میری طرف جھوٹ منسوب کریگا اسے آگ میں اپنی قرارگاہ متعین کر لینی چاہیے"

صحابہ کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ـــ آنحضورؐ کی حیاتِ مبارک اور اس کے بعد کے زمانہ میں ـــ ان کے اندر خدا کا خوف اور تقویٰ اس قدر قوی اور شدید تھا کہ وہ خدا اور اس کے رسول پر

افترا پردازی کی جرأت نہیں کر سکتے تھے، بلکہ ان کے اندر شریعت اور اس کے احکام کو اپنانے اور اس سے مدافعت کے شدید ترین جذبات موجزن تھے، اور ان کی یہ دلی تمنا ہوتی تھی کہ جو کچھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے، اس کو من وعن لوگوں تک پہنچا دیں، اس راہ میں وہ بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لیے تیار رہتے تھے، چنانچہ جب کسی گورنر یا خلیفہ کو دین سے روگرداں ہوتے دیکھتے تو بلا کسی خوف ملامت یا سزا کے بروقت ٹوک دیتے :-

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ بن الخطاب کھڑے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، جب وہ اس مقام پر پہنچے کہ " ایھا الناس لا تغالوا فی مھور النساء لو کان مکرمۃ عند اللہ لکان اولی کم بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" (اے لوگو! مہر مقرر کرنے میں اعتدال پسندی سے کام لو، اس لیے کہ اگر زیادہ مہر مقرر کرنا خدا کے نزدیک باعثِ عزو شرف ہوتا، تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس شرف کے سب سے زیادہ مستحق اور سزاوار تھے) یہ سُن کر فوراً ایک عورت مجمع سے کھڑی ہو کر بولی کہ اے عمرؓ جلد بازی نہ کرو، اللہ ہم کو ایک حق عطا فرماتا ہے اور تم ہم سے وہ حق چھین لینا چاہتے ہو۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ فَاِنْ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قِنْطَارًا ..... الخ ۔ اگر تم میں سے کوئی کسی عورت کو مالِ کثیر عطا کر دے . . . . الخ)۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایک مرد نے اپنی رائے میں ٹھوکر کھائی اور ایک عورت کی رائے صائب نکلی۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب مرتدین اور مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا، تو حضرت عمرؓ نے ان سے باقاعدہ بحث و مباحثہ کیا اور استدلال میں یہ حدیث پیش کی کہ " اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یقولوا لا الٰہ الا اللہ، فاذا قالوھا عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ ۔ مجھے حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرلیں اور جب وہ یہ اقرار کر لیں گے، تو وہ جان و مال مجھ سے محفوظ کر لیں گے الّا یہ کہ جب مال کا حق متقاضی ہو ایسا کرنے کا اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی دلیل یہ تھی کہ حدیث میں " الا بحقھا" کے الفاظ بھی آئے ہیں اور زکوٰۃ اس ضمن میں شامل ہے۔ غور کیجئے اس مکالمہ پر، حضرت عمرؓ وہ شخص ہیں جنہوں

نے سقیفہ بنی ساعدہ کی نزاع کے موقع پر سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی یہ اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ وہ حضرت ابو بکر کی فضیلت اور اولیت کے معترف تھے، مگر یہ اعتراف برتری اور بزرگی ان کی آزادانہ اظہار رائے میں مزاحم نہیں ہوا۔

حضرت عمرؓ فاروق کے عہد کا ایک واقعہ عام طور پر مشہور ہے کہ انھوں نے ایک حاملہ زانیہ کو رجم کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ حضرت علیؓ نے آن سے اختلاف رائے کرتے ہوتے فرمایا کہ "لان جعل اللہ لک علیھا سبیلا فانہ لم یجعل لک علی ما بطنھا سبیلا۔ اللہ نے آپ کو اس (عورت) پر حد کا اختیار بخشا ہے مگر اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے، اس پر نہیں"۔ حضرت عمرؓ پر اپنی رائے کی غلطی واضح ہو گئی اور انہوں نے فوراً ہی اس فیصلہ کو منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ "لولا علی لھلک عمر۔ اگر اس وقت علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

ایک مشہور صحابی ابو سعید نے مروان گورنر مدینہ کی اس حرکت پر کہ اس نے خطبہ کو عید پر مقدم رکھا، شدید احتجاج کیا اور برملا اس کی اس حرکت کو خلاف سنت قرار دیا۔

امام ذہبی کی روایت کے مطابق حجاج بن یوسف ایک دفعہ کھڑا خطبہ دے رہا تھا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اثناء خطبہ میں کھڑے ہو کر فرمایا کہ "دشمن خدا نے حرم کی بے حرمتی کی، بیت اللہ کا تہس نہس کیا اور خدا کے مقرب بندوں کو قتل کیا"۔ ذہبی ہی کی روایت کے مطابق حجاج نے ابن زبیر پر کلام اللہ بدلنے کا الزام لگایا، حضرت ابن عمرؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تم جھوٹے ہو، نہ ابن زبیر کلام اللہ کو بدل سکتے تھے اور نہ تم ہی ایسا کر سکتے ہو۔ حجاج نے اپنے معروف گستاخانہ لہجے میں کہا کہ "آپ بوڑھے ہو چکے ہیں" ابن عمرؓ بلا کسی جھجک کے بولے "اگر تم دوبارہ غلطی کرو گے، تو میں بھی تم کو دوبارہ ٹوکوں گا"۔

اس طرح کے بے شمار واقعات سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں، ان سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صحابہؓ حق گوئی میں کس قدر بے باک واقع ہوئے تھے اور حق کی مداہنت میں کتنے جاں نثار اور حق کے بارے میں کس طرح کسی رشتہ، قرابت یا دوستی کی کوئی رعایت نہیں کرتے تھے۔

ایسے لوگوں کا کسی دنیوی لالچ یا خود غرضی کے سبب آنحضورؐ کی طرف جھوٹ منسوب کرنا محال اور ناممکن ہے، اس لیے کہ جھوٹ تو وہ لوگ بولا کرتے ہیں جنہیں اندیشۂ سُود وزیاں ہو، بلکہ صحابہؓ کے لیے تو یہ بات بھی ناممکن تھی کہ آنحضورؐ کی طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کر دی جائے اور وہ خاموش سنتے رہیں۔ ان لوگوں کا حال تو یہ تھا کہ وہ بعض لوگوں کی اجتہادی غلطی پر بھی چیخ اٹھتے تھے جو بہر حال محلِ نظر ہوتی ہے، چہ جائیکہ صریح جھوٹ منسوب کر دیا جائے۔

اس ضمن میں صحابہ نے خود جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی ملاحظہ فرما لیجیے بیہقی نے براء سے روایت کی ہے کہ "ہم میں سے ہر شخص، کاروباری مصروفیتوں کے باعث، آنحضورؐ سے براہِ راست احادیث کا استفادہ نہیں کر سکتا تھا، لیکن اس زمانہ میں لوگ جھوٹ بولنا نہیں جانتے تھے اور براہِ راست حدیثیں سننے والا دوسروں کو سنا دیتا"

بیہقی ہی نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ حضرت انسؓ نے ایک مرتبہ ایک حدیث بیان فرمائی، سننے والے نے دریافت کیا کہ کیا آپ نے یہ حدیث آنحضورؐ سے براہِ راست سنی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ "یقیناً، اس لیے کہ اگرچہ میں نے براہِ راست نہیں سُنی ہے، مگر ایک ایسے شخص سے سنی ہے، جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا، واللہ ہم نہ جھوٹ بولتے تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ جھوٹ کیا بلا ہوتی ہے"

ان شواہد کے بعد اس شک کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ صحابہ کے زمانہ میں جھوٹ بولا جا سکتا ہے اور یہ بات بھی محلِ نظر نہیں رہ جاتی کہ صحابہ ایک دوسرے پر کامل اعتماد رکھتے تھے، ان کے درمیان بعض فقہی اختلافات تو ہوتے تھے، مگر یہ اختلافات کبھی اساسی نہیں بلکہ کسی دینی معاملہ میں توجیہہ و تاویل کی نوعیت کے ہوتے تھے، ان لوگوں کو محض حق کی طلب تھی۔

تابعین کے عہد کے بارے میں بھی بلا کسی تردد کے یہ بات کہی جا سکتی ہے، کہ ان کے زمانے میں جھوٹ یا وضع حدیث کا فتنہ بعد کے زمانہ کی بہ نسبت بہت ہی کم تھا، اس کا سبب ایک تو یہ تھا کہ اس وقت آنحضور صلعم کے مرتبہ و مقام کا احترام و تقویٰ و تدیّن کے اثرات پہلے زمانہ کے

مقابلہ میں قوی تر تھے، اور دوسرا سبب یہ تھا کہ اس وقت سیاسی اختلافات ابھی ابتدائی حالت میں تھے، اس لیے وضعِ حدیث کے محرکات محدود تھے اور اس کے علاوہ ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس وقت خود صحابہؓ اور دین کا علم رکھنے والے عادل، بیدار، محتاط و متحفظ تابعین موجود تھے اور ان کے ہوتے ہوئے کذابوں کی دال نہیں گل سکتی تھی، بلکہ ان کی ذلیل حرکتوں اور سازشوں کا بھانڈا ہر وقت پھوٹ جاتا تھا، یا کم از کم ان کی اس طرح کی تگ و تاز محدود ہو جاتی تھی۔

احادیث میں وضع کے اسباب ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے آخری زمانۂ خلافت اور حضرت علیؓ کے پورے عہدِ خلافت میں جو سیاسی اختلافات رونما ہوتے وہی حدیث میں کذب و وضع کے اصلی اسباب ہیں۔ اور ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ سب سے پہلے اس کام کی جرأت شیعہ نے کی، چونکہ عراق ان کا مرکز تھا، اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہی وہ پہلا مقام تھا جہاں حدیثیں وضع کی گئیں۔ اسی حقیقت کی طرف بعض ائمہ نے اشارہ کیا ہے، امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں سے جو حدیث ایک بالشت لمبی نکلتی تھی، عراق سے واپس آکر اسی حدیث کا طول ایک گز ہو جاتا تھا۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ:

"عراق ٹکسال ہے، جہاں حدیثیں سکے کی طرح ڈھال کر ملک میں رائج کر دی جاتی ہیں"۔

جہاں وضعِ حدیث کا سب سے بڑا سبب سیاسی اختلاف تھا، وہاں کچھ دوسرے چھوٹے چھوٹے اسباب بھی ہیں جن کا موضوع احادیث کے رواج پانے میں کافی دخل ہے، ہم بالاجمال ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔

ا۔ سیاسی اختلافات کم و بیش تمام ہی فرقے آنحضورؐ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کی گندگی میں ملوث تھے، لیکن شیعہ یا رافضہ اس معاملہ میں سب سے پیش پیش تھے، امام مالکؒ سے شیعہ کے بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ نہ ان سے بات چیت کرو اور نہ ان سے حدیث روایت کیا کرو، یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ شریک بن عبداللہ جو معتدل قسم کے تشیع پسند تھے، فرماتے ہیں کہ میں ہر شخص سے حدیث سنتا اور قبول کر لیتا ہوں، سوائے شیعہ کے، اس لیے کہ یہ لوگ حدیث گھڑ کر اس کو دین کا درجہ دے دیتے ہیں۔ حمادؒ بن سلمہ نے فرمایا کہ مجھ سے ایک رافضی سردار نے کہا کہ "ہم جب کہیں اکٹھے ہوتے

اور کوئی چیز پسند آجاتی، تو اُسے حدیث بنا کر مشہور کر دیتے۔" امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے رافضہ سے زیادہ جھوٹے لوگ نہیں دیکھے" ان لوگوں کی بے شمار تصنیف کردہ احادیث میں سے چند یہاں درج کی جاتی ہیں۔ موضوع احادیث میں سے ایک شاہکار ملاحظہ ہو، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی صلعم جب حجۃ الوداع سے واپس تشریف لا رہے تھے، تو راستے میں ایک مقام غدیرِ خم نامی آیا، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ لیا اور صحابہ کے درمیان کھڑے ہو کر فرمایا:۔

"هذا وصيي واخي والخليفة من بعدي، فاسمعوا له واطيعوه" یہ، یعنی علی — میرے ولی عہد اور بھائی اور میرے بعد ہونے والے خلیفہ ہیں، لہٰذا ان کی سننا اور اطاعت کرنا!" یہ حدیث بلاشبہ رافضہ کی ایجاد ہے۔ ایک دوسری حدیث ملاحظہ ہو:۔ من اراد ان ينظر الى آدم في علمه والى نوح في تقواه والى ابراهيم في حلمه والى موسى في هيبته والى عيسى في عبادته، فلينظر الى عليّ۔ جو آدم کے وسعتِ علم، نوحؑ کے تقویٰ، ابراہیمؑ کی بردباری، موسیٰ کے جلال اور عیسیٰ کی عبادت کا مشاہدہ کرنا چاہے، اسے علیؓ کی طرف دیکھ لینا چاہیے۔

ایک دوسری حدیث:۔ انا ميزان العلم وعلي كفتاه والحسن والحسين خيوطه وفاطمة علاقته والائمة منا عمود توزن فيه اعمال المحبين لنا والمبغضين لنا۔ میں علم کی ترازو ہوں، علیؓ اس کے دونوں پلڑے ہیں، حسن اور حسین اس کی ڈوریاں ہیں، فاطمہ اس ترازو کا قبضہ ہیں اور ہمارے خاندان کے ائمہ اس کی ڈنڈی، اس ترازو میں ہم سے محبت اور بغض کرنے والوں کے اعمال تولے جائیں گے۔" ایک اور حدیث ہے:۔ حب عليّ حسنة لا يضر معها سيئة وبغضه سيئة لا ينفع معها حسنة۔" علیؓ سے محبت کرنا ایسی نیکی ہے جو ہر برائی کا کفارہ بن سکتی ہے اور ان سے بغض کرنا ایسی برائی ہے جس کا کفارہ کوئی نیکی نہیں بن سکتی۔ ان سب نمونوں سے نادر نمونہ ملاحظہ ہو:۔ "لما اسري بالنبي اتاه جبريل بسفرجلة من الجنة، فاكلها، فعلقت السيدة خديجة بفاطمة۔ فكان اذا اشتاق الى رائحة الجنة شم فاطمة" جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج ہوئی تو حضرت جبریلؑ آپ کے پاس ایک سیب لائے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے اسے تناول فرمایا، اور اسی کے اثر سے حضرت خدیجہؓ کو حضرت فاطمہؓ کا حمل قرار پا گیا، جب کبھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت کا شوق فرماتے، تو حضرت فاطمہؓ کو سونگھ لیا کرتے"۔ اس حدیث" میں وضع اور کذب کی علامتیں بڑے بھونڈے طور سے نمایاں ہیں، کیونکہ حضرت فاطمہؓ معراج سے پہلے پیدا ہو چکی تھیں اور حضرت خدیجہ نماز فرض ہونے سے پہلے وفات پا چکی تھیں اور یہ امر متفق علیہ ہے کہ نماز معراج کے وقت فرض کی گئی۔

شیعہ نے حضرت علیؓ اور آل بیت کی مدح اور تعریف ہی میں حدیثیں نہیں وضع کیں، بلکہ شیعہ احادیث ایسی بھی وضع کیں جن سے واضح طور پر صحابہؓ اور خصوصیت کے ساتھ شیخین اور سربرآوردہ صحابہؓ کی مذمت اور تنقیص ہوتی ہے، اور ان حضرات نے اس باب میں اس حد تک غلو کیا ہے کہ سابق الذکر شیعی مصنف ابن ابی الحدید کو اس موقع پر اپنے موقف کی وضاحت کے لیے حسب ذیل صفائی پیش کرنی پڑی :"وہ ناخوشگوار واقعات جن کا ذکر شیعہ حضرات کرتے ہیں، مثلاً حضرت فاطمہ کے گھر کی طرف چھچھوندر کا چھوڑنا، یا یہ کہ حضرت عمرؓ نے ان کو (حضرت فاطمہؓ) اتنے زور کا کوڑا مارا کہ وہ ان کے (حضرت فاطمہ کے) بازو میں بازو بند کی طرح لپٹ گیا، یا یہ کہ حضرت عمرؓ نے ان (حضرت فاطمہ) کو دروازے اور دیوار کے درمیان اس زور سے دبا دیا کہ وہ اپنے ابا جان (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دہائی دیتے کر چیخنے لگیں۔ یا یہ کہ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ کی گردن میں پھندا ڈال کر ان کو گھسیٹنے لگے، حضرت فاطمہؓ ان کے پیچھے دھاڑیں مارما کر رو رہی تھیں اور حضرت حسنؓ اور حسینؓ بھی رو رہے تھے"۔ اس کے بعد مصنف مذکور اس نوع کے بہت سے دوسرے واقعات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے "یہ تمام واقعات ہمارے نزدیک بے بنیاد ہیں اور ہمارے ہم مذہبوں میں سے کوئی بھی ان کو تسلیم نہیں کرتا، اور نہ محدثین کو اس قسم کی روایتوں کی کوئی خبر ہے۔ یہ صرف شیعہ حضرات کی کارگزاری ہے۔ حضرت معاویہؓ کے متعلق بھی ان لوگوں نے نہایت توہین آمیز حدیثیں گھڑی ہیں۔ مثلاً: "جب تم معاویہ کو میرے منبر پر دیکھنا تو قتل کر دینا"۔ یا "حضرت معاویہ اور عمرو بن العاص دونوں کی تنقیص میں مثلاً: "اللھم ارکسھما فی الفتنة ودعھما فی النار دعا"۔

واقعہ یہ ہے کہ رافضی گروہ نے احادیث وضع کرنے میں خطرناک حد تک تجاوز کیا ہے۔ خلیل نے اس صورتِ حال کا نقشہ اپنی کتاب "الارشاد" میں ان الفاظ میں کھینچا ہے "رافضی فرقہ نے اہلِ بیت کی فضیلت میں تقریباً تین لاکھ احادیث وضع کی ہیں" اگرچہ خلیل کے اس قول میں مبالغہ ہے مگر اس سے یہ بات تو ضرور ہی ظاہر ہوتی ہے کہ ان لوگوں نے حدیثیں بہت کثرت سے گھڑیں۔ ایک مسلمان ٹھٹک کر رک جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ آنحضورؐ پر یہ جرأت! . . . . اگر وہ یہ نہ جانتا ہو کہ رافضی گروہ تقریباً تمام کا تمام عجمی تھا اور اس نے محبتِ آلِ بیت کا ڈھونگ صرف اس لیے رچایا تھا کہ اس طرح وہ اسلام کے محکم شیرازہ کو بکھیرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ . . . ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے جو اگرچہ ایمان لا چکے تھے، مگر ابھی ناپختہ ذہن و ایمان تھے اور ابھی ان کے اندر سابقہ مشرکانہ عقائد و محرکات موجود تھے، ان سے یہ بعید نہ تھا کہ وہ اپنے دل میں چھپے ہوئے کسی جذبہ کے اظہار کے وقت، آنحضورؐ کی طرف جھوٹ بات منسوب کرکے، اپنی بات کو مقبول بنائیں۔ جذبات کے اظہار کا یہ طریقہ بالکل جاہلانہ اور طفلانہ ہے۔

ایک طرف تو یہ لوگ تھے، دوسری طرف فرقہ اہلِ سنت کے جاہل عوام تھے، جو ان سے دست و گریباں ہو گئے اور انہیں ہتھکنڈوں کے ساتھ شیعہ استعمال کرتے تھے۔ ادھر جھوٹ کو تقویت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا گیا، تو ادھر سے بھی اس کا جواب جھوٹ ہی کے ذریعہ دیا گیا۔ اگرچہ اس دوسرے گروہ کا جھوٹ اول الذکر سے محدود اور بہت ہی کم تھا۔ ان لوگوں کی ایک حدیث ملاحظہ ہو: "ما فی الجنة شجرة الا مكتوب على ورقة منها لا اله الا الله محمد رسول الله، ابوبكر الصديق، عمر الفاروق، عثمان ذوالنورين۔ جنت کے ہر درخت کے ہر پتّے پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، ابوبکر الصدیق، عمر الفاروق، عثمان ذوالنورین، لکھا ہوا ہے۔

اسی طرح معاویہؓ اور بنو امیہ کے طرفداروں نے بھی اپنی حمایت میں کچھ حدیثیں گھڑیں، مثلاً۔ "الامناء ثلاثة انا وجبريل ومعاويه۔ میں، جبرئیل اور معاویہ تین ہی افراد سراسر مامون ہیں" یا مثلاً۔ "انت منی و انا منك" تم میرے ہو اے معاویہ اور میں تمہارا ہوں" یا مثلاً۔ "لا تفقد

فی الجنة الا معاویة فیاتی آنفا بعد وقت طویل. فاقول من این یا معاویة، فیقول من عند ربی یناجینی و اناجیه، فیقول ھذا بما نیل من عرضك فی الدنیا یہ جنت میں مجھے صرف معاویہ کی تلاش ہو گی، معاویہؓ ایک طویل وقفہ کے بعد مجھ سے ملیں گے، میں معاویہ سے کہوں گا کہاں سے آ رہے ہو؟ معاویہؓ جواب دیں گے، اپنے رب کے حضور سے، میرا رب مجھ سے سرگوشیاں کر رہا تھا اور میں اس سے۔ آنحضورؐ فرمائیں گے۔ یہ مقامِ بلند تمہیں اس لیے حاصل ہوا کہ دنیا میں تمہاری تنقیص کی گئی تھی"۔

اسی طرح عباسیوں کے مؤیدین نے بھی اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کے لیے جھوٹی حدیثوں کا سہارا لیا۔ چنانچہ علی کرم اللہ وجہہ کی وصایہ کے مقابلہ میں عباس رضی اللہ عنہ کی وصایہ کا دعویٰ کر دیا اور آنحضورؐ کی طرف یہ جھوٹی حدیث منسوب کر دی گئی:" العباس وصیی و وارثی عباس میرے جانشین اور وارث ہیں"۔ اس گروہ کا سفید جھوٹ ذیل کی حدیث ہے:" اذا کان سنة خمس و ثلاثین و مائة فھی لك و لولاك، منھم السفاح و المنصور و المھدی۔ جب ۱۳۵ھ آئے گا تو وہ تمہاری اور تمہاری اولاد کی حکومت کا دور ہو گا، ان حکمرانوں میں سفاح، منصور اور مہدی قابلِ ذکر خلفاء ہیں۔

کیا خوارج بھی حدیثیں گھڑتے تھے؟ علماء حدیث کی رائے یہ ہے کہ تمام اسلامی فرقوں میں خوارج کا گروہ اس لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے کہ اس نے حدیثیں بہت کم وضع کی ہیں — یہ فرقہ حضرت ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص کی تحکیم کے بعد حضرت علیؓ کا باغی ہو گیا تھا — ان کی کم دروغ گوئی کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ گناہ کبیرہ یا محض گناہ کو کفر متصور کرتے تھے۔ کبعی نے اپنی کتاب " الفرق بین الفرق" میں ان کے اس عقیدہ کی وضاحت کی ہے۔ یہ لوگ کذب و فسق کو حرام سمجھتے تھے اور ان کے اندر تقویٰ بدرجہ اتم موجود تھا، اس کے باوجود اس گروہ کے بعض رؤسا وضع حدیث کے الزام سے محفوظ نہیں رہ سکے، ان کے ایک سردار کا مقولہ عام طور پر منقول اور مروی ہے:" حدیثیں دین کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے اپنا دین حاصل کرتے وقت چھان پھٹک کر دیکھ لیا کرو

کہ کس سے حاصل کر رہے ہو، کیونکہ اس سے پہلے جب ہم کسی معاملہ کو اپنی پسند کے مطابق ثابت کرنا یا لوگوں سے منوانا چاہتے تھے، تو اس کو حدیث کہہ کر پیش کرتے تھے۔"

عبدالرحمٰن مہدی کی رائے یہ ہے کہ حسب ذیل حدیث خوارج اور زنادقہ کی وضع کی ہوئی ہے:۔

اذا اتاکم عنی حدیث فاعرضوہ علیٰ کتاب اللہ، فان وافق کتاب اللہ فانا قلتہ" "جب تمہیں میری کوئی حدیث سنائی جائے، تو تم اسے کتاب اللہ پر پرکھ دیکھ لو، اگر اس معیار پر پوری اترے تو سمجھ لو کہ وہ میرا قول ہے۔

خوارج کے بارے میں متقدمین اور متاخرین اہل علم کی تقریباً یہی رائے ہے، مگر مجھ کو اب تک کوئی ایسی حدیث نہیں ملی، جس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہو کہ اس کو کسی خارجی نے وضع کیا ہے، اس موضوع پر میں نے کافی ورق گردانی کی مگر ناکام رہا۔ رہا وہ واقعہ جو ایک خارجی سردار کے متعلق مذکور ہے، تو مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ سردار کون ہے۔ بعینہٖ اسی طرح کی ایک روایت حماد بن سلمہ سے ایک رافضی سردار کے بارے میں بھی مروی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حدیث ایک خارجی کی طرف غلطی سے منسوب ہو گئی، خصوصاً جبکہ ہمیں ان کی گھڑی ہوئی ایک حدیث بھی نہیں ملتی۔

عبدالرحمٰن بن مہدی کا یہ کہنا کہ " اذا اتاکم عنی حدیث . . . . . الخ والی حدیث زنادقہ اور خوارج کی گھڑی ہوئی ہے، اس کا کوئی ثبوت اور دلیل نہیں، کیونکہ انہوں نے گھڑنے والے کا نام نہیں لیا اور نہ یہ بتایا کہ یہ کب گھڑی گئی، اس میں شک کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ اس حدیث میں خوارج کے ساتھ ساتھ زنادقہ کا لفظ بھی آتا ہے، اگر اس کو مان لیا جائے، تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خوارج اور زنادقہ نے اس کو گھڑنے پر کیونکر اتفاق کر لیا، آیا دونوں گروہوں نے بیک وقت گھڑا یا ان میں سے کس نے پہل کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن مہدی کے علاوہ دوسرے لوگوں نے محض زنادقہ کا ذکر کیا ہے۔ عون المعبود (۴/۳۲۹) میں مذکور ہے کہ "بعض لوگوں کی یہ روایت کہ "جب تم میری کوئی حدیث سنو، تو اس کو قرآن پر پرکھ دیکھ لیا کرو، اگر اس معیار پر پوری اترے، (باقی صفحہ پر)

انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام[1]

(عبد الحمید ایم اے)

وہ دورِ تہذیب جس میں ہم اس وقت سانس لے رہے ہیں تاریخ انسانی کا سب سے نرالا دور ہے۔ یہ پہلا دور ہے جس میں انسان نے ایک سوچے سمجھے پلان کے مطابق خالق کائنات کو دنیا کے سارے معاملات سے بے دخل کر دیا، اور اپنے فکر و عمل کی سر بفلک عمارت خالص الحاد کی بنیادوں پہ استوار کی۔ اس تجربہ سے انسان کو بڑی ہی توقعات وابستہ تھیں، وہ سمجھتا تھا کہ علوم و فنون کی ترقی اور سرمایہ داری نظام کی دولت آفرینی انسانی زندگی کے تمام اخلاقی اور سماجی مسائل حل کر دے گی مگر افسوس کہ مغربی تہذیب و تمدن کا پودا پوری طرح بار آور ہونے کے بعد جو پھل انسانیت کی جھولی میں گرا رہا ہے وہ اتنے کڑوے اور تلخ ہیں کہ اس تمدن کے باغبانوں کو بھی سخت حیرت ہوئی ہے اور اب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ آخر اس کے اگلنے میں کونسی ایسی خامی رہ گئی ہے جس کی وجہ سے نتیجہ ان کی امید کے مطابق نہیں نکلا۔ مگر چونکہ ان کے فکر کا تقاضا صرف حسّی فلسفۂ زندگی کے مابین ہی رقص کرنے پر مجبور ہے اس لیے وہ اس راہ سے ہٹ کر کسی نئی راہ کو اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ابھی تک اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ مصائب کا سرچشمہ اس شجرِ خبیث کی محض شاخوں میں ہے۔ اس لیے وہ شاخوں کی قطع و برید میں اپنا قیمتی وقت اور محنتیں ضائع کر رہے ہیں مگر نہیں سمجھتے کہ خرابی جو کچھ ہے اس درخت کی جڑ میں ہے اور اصلِ فاسد سے فرعِ صالح نکلنے کی امید رکھنا نادانی سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

اس تہذیب کا تجزیہ کرنے سے پہلے چند امور کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ کسی نظریہ کا صحیح تجزیہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم بالکل خالی الذہن ہو کر اس کے متعلق غور کریں اور اگر ہم اس پہ غور کرنے سے پہلے ہی ایک رائے قائم کر لیں تو ہم صحیح نتائج پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس تمدن کی

[1] اس کا خاکہ نعیم صاحب کی تقریر تحریک اسلامی کا دوسری تحریکات سے تقابل سے لیا گیا ہے۔

رنگا رنگ کلیوں کو چٹکتے دیکھ کر حیرت زدہ نہ ہو جائیں بلکہ اس کی جڑوں میں اتر کر دیکھیں کہ وہ کس قسم کی ہیں اور خود اندازہ لگائیں کہ اس غازۂ تہذیب کے پیچھے انسانی فطرت کی کونسی سیاہی اور حرص و تصرف کی کونسی قوتیں کارفرما ہیں۔

ثانیاً، حیات، تمام انسانی اعمال کا منتہائے مقصود ہے۔ انسان کے سارے افکار و اعمال کا مقصد صرف یہی ہے کہ اُس کی زندگی شاندار، موثر اور افزوں ہو جائے۔ کسی تہذیب و تمدن کی کامیابی کا معیار یہ نہیں کہ افکار کے شیش محل کھڑے کر دے بلکہ اصل معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کو صبر و سکون کی نعمت سے مالا مال کر دے اور پوری نوعِ انسانی کو تاریکی اور درندگی سے نکال کر اس مقام پر لے آئے جہاں وہ اطمینان کے ساتھ اپنا سفرِ حیات جاری رکھ سکے۔ جو تہذیب انسانیت کو زیادہ سے زیادہ ذہنی سکون اور اطمینانِ قلب بخش دے وہ کامیاب ہے ورنہ ناکام۔

ثالثاً، ممکن ہے سطح بین آنکھوں کو سرمایہ داری، فاشزم اور اشتراکیت کے مابین ایک بنیادی فرق دکھائی دیتا ہو۔ مگر درحقیقت سرمایہ داری، فاشزم اور اشتمالیت ایک بڑے "ازم" کے مختلف پرتو ہیں جس کو حسیت (Sensate) کہا جاتا ہے۔

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

ان کے درمیان جو فرق ہے وہ صرف تفصیلات میں ہے۔ اصل میں یہ سب ایک ہی ہیں۔ کیونکہ ان کے ظاہری اختلافات کے باوجود جن عقلی اور اخلاقی عناصر سے ان کی ترکیب ہوتی ہے۔ ان کا مزاج ایک ہے۔ سرمایہ داری نام ہے ایک ایسی معاشی تنظیم کا جس کی غایتِ اولیٰ مادی منافع کا حصول ہے۔ اشتمالیت اس سے اگلا قدم ہے جس میں تمام چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کو ختم کر کے پوری کی پوری معاشی اور معاشرتی زندگی کو ایک بہت بڑے سرمایہ دار یعنی ریاست کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ فاشزم، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان ایک تیسری راہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ، جرمنی اور اٹلی، روس اور اس کے ہمنوا ممالک کے طرزِ عمل میں بہت حد تک یگانگت ہے۔ ان

میں سے ہر ملک نے اپنی ذاتی منفعت کے پیش نظر پچھلے چند سال میں اخلاقی حدود کو نہایت ہی بیدردی سے پامال کیا ہے۔ گزشتہ جنگ میں فسطائی اٹلی کے فرانس پر حملے اور روس کی جاپان پر فوج کشی میں جبکہ وہ میدان جنگ میں بازی ہار چکا تھا کونسا بنیادی فرق ہے۔ مزدوروں کی جنت میں بھی سرمایہ دارانہ ممالک کی طرح ہی سارے ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ یہاں بھی ظلم و ستم کا اسی طرح دور دورہ ہے جس طرح کہ فسطائی ممالک میں، یہاں بھی ذاتی منفعت تمام دوسرے محرکات پر غالب ہے یہاں بھی کمزوروں پر اسی طرح ستم ڈھائے جا رہے ہیں جس طرح کہ سرمایہ دارانہ حکومتوں میں۔ کوئی ایماندار شخص بھی جو بصارت رکھتا ہو اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ روسی آمر کا راج ظلم کے اعتبار سے نازی آمریت اور چرچل کی نام نہاد جمہوریت سے کسی طرح کم نہیں۔ اس یکسانیت کی آخر اس کے علاوہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ جس بیج سے یہ کونپلیں پھوٹی ہیں وہ ایک ہی ہے۔

بیسویں صدی کی مغربی تہذیب کوئی ایسی نوعمر تہذیب نہیں ہے جس کی پیدائش پچھلی صدیوں میں نہ ہوئی ہو۔ دراصل اس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ اس کا نسبی تعلق یونانی اور رومی تہذیب سے ہے۔ ان دونوں تہذیبوں نے اپنے ترکہ میں جو سیاسی نظام اور اجتماعی قدریں اور عقلی و علمی سرمایہ چھوڑا وہ اس کے حصے میں آیا۔ اس کے سارے رجحانات اور خصوصیات اس کو نسلاً بعد نسل منتقل ہوئے۔

یونانی تہذیب مغربی ذہنیت کا سب سے پہلا اور واضح نمونہ تھی۔ یہ وہ پہلا تمدن تھا جو خالص حسی فلسفۂ حیات کی بنیاد پر قائم ہوا اور یونانی قوم ایک مخصوص نظریۂ تمدن کے علمبردار کی حیثیت سے دنیا پر چھا گئی۔ مسلمانوں کے عروج کے ساتھ اس تمدن کو بھی زوال آیا مگر یہ دنیا سے نیست و نابود نہ ہوا اور اب انیسویں صدی میں اس نے ایک نئے لباس میں ظہور کیا۔ اس لباس کی چمک دمک سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ نیا ہے لیکن دراصل اس کا تانا بانا یونانیوں اور رومیوں کے ہاتھ کا کاتا ہوا ہے۔ مغربی حکماء نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ چند سال ہوئے ڈاکٹر ہاس نے جنیوا میں "یورپی تمدن کیا ہے" کے عنوان سے تین لیکچر دیے تھے ان کا اقتباس خالدہ ادیب خانم کے توسط سے پیش کیا جاتا ہے۔

"موجودہ مغربی تمدن کا مرکز قدیم یونان تھا۔ اس کا اصل الاصول انسان کی تمام قوتوں کا ہم آہنگ

نشو و نما اور سب سے بڑا معیار خوبصورت اور سڈول جسم سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں زیادہ زور محسوسات پر ہے۔ جسمانی تربیت، ورزشی کھیلوں اور رقص وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ذہنی تعلیم جو شاعری، موسیقی، ڈراما، فلسفہ اور سائنس وغیرہ پر مشتمل تھی۔ ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے پاتی تھی تاکہ ذہن کی ترقی سے جسم کو نقصان نہ پہنچنے پائے۔ یونان کے مذہب میں نہ رہبانیت کا مغز ہے نہ باطنیت کا۔ نہ علم دین ہے نہ پیشوایان دین کا طبقہ۔"

یونانیوں کے جانشین رومی ہوئے اور قوت، مملکت کی تنظیم، سلطنت کی وسعت اور عسکری صفات میں ان پر فوقیت لے گئے لیکن علم و ادب، تہذیب و شائستگی میں وہ یونانیوں کے درجۂ کمال کو نہ پہنچ سکے۔ اس وجہ سے ان کے ذہنوں پر یونانیوں کی گرفت ہمیشہ مضبوط رہی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یونانی تمدن سے مغلوب رہے۔ چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ قدیم ترین رومی مورخین یونان ہی کی زبان میں تصنیف کرتے تھے۔ اور یہ دستور عرصۂ دراز تک قائم رہا۔ اور صرف تصنیف و تالیف پر کیا موقوف، اطوار و خصائل، طرز معاشرت، جذبات و احساسات غرض ہر شعبۂ حیات میں یونانی تمدن رومی تمدن پر غالب آ گیا۔ رومی بلا تکلف یونانیوں کی تقلید کرتے تھے اور اس تقلید پر فخر کرتے تھے۔ اس طرح علم و ادب، اطوار و اخلاق کے ذریعہ یونانی قوم کا کلچر رومیوں میں منتقل ہو گیا۔

اس دور کا ایک بڑا انقلاب انگیز واقعہ عیسائیت کا بت پرست روما کے تخت سلطنت پر فائز ہونا تھا۔ مورخین قسطنطین کی قبول مسیحیت کو عیسائیت کی فتح خیال کرتے ہیں مگر درحقیقت یہ ایک حادثہ تھا جس سے عیسائیت کو سابقہ پیش آیا۔ جب دنیا پرست لوگوں نے یہ دیکھا کہ یہ مذہب اب ریاست کا مذہب بن گیا ہے تو وہ بغیر کسی فکر و نظر کے انقلاب کے محض دنیوی فوائد و لذائذ کو سمیٹنے کے لیے عیسائی بن گئے۔ ڈریپر لکھتا ہے:۔

"فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے ملنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیادار لوگ جنہیں مذہب کی ذرہ بھر پروا نہ تھی مسیحیت کے سب سے زیادہ

لہ تاریخ اخلاق یورپ از لیکی

پادریوں پر مہیب اخلاقی جرائم کے الزامات عائد کیے گئے۔ سینٹ جروم کا مقولہ ہے کہ اہل کلیسا کے تعیش کے سامنے امراء اور دولتمندوں کی عیش و عشرت بھی شرماتی تھی۔ خود پوپ اخلاقی انحطاط میں مبتلا تھے اور دولت کی ہوس اور مال کا عشق تو ان پر اتنا غالب تھا کہ منصب اور عہدے معمولی سامانِ تجارت کی طرح بکتے تھے، اور کبھی کبھی ان کا نیلام ہوتا تھا۔ جنت کے قبالے، مغفرت کے پروانے، نقضِ قانون کے اجازت نامے اور نجات کے سرٹیفکیٹ جائداد کی معمولی دستاویزوں کی طرح بے تکلف فروخت ہوتے تھے۔ مذہبی عہدہ دار سخت راشی اور سود خوار تھے۔ فضول خرچی اور اسراف کا یہ حال تھا کہ پاپائے انوسینٹ ہشتم نے پاپائیت کا تاج رہن رکھا۔ اور پاپائے لیو دہم کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین پاپاؤں کی آمدنی اڑا ڈالی یعنی سابق پوپ نے جو دولت چھوڑی تھی وہ خرچ کی۔ اس کے بعد اپنی دولت اڑائی جب یہ بھی کافی نہ ہوئی۔ تو اپنے جانشین کی آمدنی کو پہلے سے وصول کر کے صرف کر ڈالا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مملکتِ فرانس کی پوری آمدنی بھی ان پاپاؤں کے اخراجات کے لیے کافی نہ ہوتی تھی[1]

اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں عقلیت (Rationalism) نے جنم لیا۔ فکر و نظر کی یہ تبدیلی ان مسلم فاتحین کی مرہونِ منت ہے جو دورِ متوسط میں نئے افکار کے ساتھ دنیائے مغرب میں داخل ہوئے۔ یہ لوگ اگرچہ ہدایتِ الٰہی کے ان معنوں میں علمبردار نہ تھے جن میں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام تھے۔ ان میں کافی حد تک دنیا پرستی آچکی تھی۔ مگر اس کے باوجود جو نیا نظامِ حیات وہ دنیا کے سامنے پیش کرتے تھے وہ کسی حد تک مسخ ہونے کے باوجود بھی مذہبی عقائد میں تعقل، علوم و فنون میں تجربہ و تحقیق، سیاست میں ایک پاکیزہ جمہوریت اور معاشرت میں اخوت و مساوات کے گوناگوں مظاہر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ان کے اپنے کردار کو اگرچہ قرونِ اول کے مسلمانوں سے دُور کی بھی نسبت نہ تھی تاہم عیسائیت کے پیروؤں کے مقابلے میں ان کے فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامت اور مزاج میں اعتدال زیادہ تھا۔ ان کے ذہن شستہ و وسیع اور نگاہیں زیادہ بلند تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ مسلم فاتحین اہلِ مغرب کو اپنے نظامِ حیات کا مومن نہ بنا سکے، لیکن انہوں نے ان کو اور ان کی تاریخ کو شدید طور پر متاثر کیا۔ ان کی پوری زندگی میں ایک

[1] معرکۂ مذہب و سائنس

عظیم تموج رونما ہوا۔ انسانیت کے جسم میں گرم خون کی لہر دوڑ گئی۔ نبض میں حرکت اور جسم میں تھرتھراہٹ سی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے زندگی اور اس کے مسائل پر غور کرنا شروع کر دیا۔ تقلید کی زنجیریں ٹوٹنا شروع ہو گئیں ان روشن خیال مفکرین نے بڑی جسارت سے ان تمام بے اصل نظریات کی تردید کی۔ جو جغرافیہ تاریخ اور طبیعیات سے متعلق ان کی مذہبی کتابوں میں پائے جاتے تھے۔ ان پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا اس کے علاوہ انہوں نے اہلِ کلیسا کی زندگیوں کے بدنما پہلوؤں کو بھی بے نقاب کرنا شروع کر دیا۔ وہ ان مذہبی سوداگروں کی بے رحمی اور بے اصولی کے خلاف بڑی ہی جرأت مندی سے صف آرا ہوئے —

اُدھر اہلِ مذہب نے حالات کی نزاکت کو محسوس کرنے کے بجائے اپنے دماغی توازن کو کھو دیا۔ وہ وقتی فائدہ اور نقصان میں اتنا کھو چکے تھے کہ اپنی خلافِ عقل حرکات کے دور رس نتائج سے قطعاً آنکھیں بند کر لیں۔ انہوں نے ہر نئی آواز کو بغیر غور کیے دبانا اور کچلنا شروع کر دیا۔ اور اس نئی تحریک کو دبانے کے لیے وہ حربے استعمال کیے۔ اور اتنی سختیاں کیں کہ ان کے تصور سے آج بھی خون کھول اٹھتا ہے۔ طاقت کے نشے میں بدمست ہو کر انہوں نے ان آزاد خیال لوگوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھانے شروع کیے۔ مذہبی عدالتیں قائم ہوئیں جنہوں نے ان "باغیوں" کو موت کی سزائیں دیں۔ اندازہ ہے کہ اس محکمہ نے جن لوگوں کو سزائیں دیں ان کی تعداد تین لاکھ سے کم نہیں۔ ان میں سے بتیس ہزار کو زندہ جلا دیا گیا۔ انہی زندہ جلائے جانے والوں میں ہیئت و طبیعیات کا مشہور عالم برونو بھی ہے۔ جس کا سب سے بڑا جرم اربابِ کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ محکمۂ احتساب کے حکام نے اسے اس سفارش کے ساتھ دنیوی حکام کے سپرد کیا کہ اسے نہایت نرمی سے سزا دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی گرنے نہ پائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ اسی طرح مشہور طبیعی عالم گلیلیو کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ وہ زمین کے سورج کے گرد گھومنے کا قائل ہے[1]۔

اہلِ کلیسا کے ان لرزہ خیز مظالم اور چیرہ دستیوں نے پورے یورپ میں ایک ہلچل مچا دی۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر جن کے مفادات کلیسا سے وابستہ تھے۔ سب کے سب کلیسا سے نفرت کرنے لگے اور

[1] مسلمانوں کے زوال سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا، مولانا ابو الحسن علی ندوی

نفرت و عداوت کے اس جوش میں بدقسمتی سے انہوں نے مذہب کے پورے نظام کو تہ و بالا کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ وہ جنگ جو شروع شروع میں عیاش قسم کے اہلِ کلیسا کے خلاف لڑی جا رہی تھی وہ بعد میں عیسائی مذہب کے خلاف بھی شروع ہو گئی اور اس کے بعد ہر مذہب کے خلاف۔ ان آزاد خیال اور تجدد پسند لوگوں میں اتنا صبر و ضبط، غور و مطالعہ کی قوت اور عقل و اجتہاد کی قابلیت نہ تھی کہ وہ اصل دین اور دین کی غلط نمائندگی کرنے والوں کے درمیان تمیز کر سکتے۔ انہوں نے جذبات کی رو میں بہہ کر یہ سوچنا تک گوارا نہ کیا۔ کہ ان نفرت انگیز واقعات کا دین کہاں تک ذمہ دار ہے۔ اور کہاں تک اس دین کو بیچنے والوں کی ذاتی حرص اور جہالت کا ذمہ دار ہے۔ چنانچہ غصہ میں آکر وہ ہدایتِ الٰہی کے باغی ہو گئے۔ گویا اہلِ کلیسا کی حماقت کی وجہ سے پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں ایک ایسی جذباتی کشمکش شروع ہوئی، جس میں چڑ اور ضد سے بہک کر "تبدیلی" کے جذبات خالص الحاد کے راستہ پر پڑ گئے۔ اور اس طویل کشمکش کے بعد مغرب میں تہذیبِ الحاد (Secular) کا دور دورہ شروع ہوا۔ اس تحریک کے علمبرداروں نے کائنات کی بدیہی شہادتوں کے باوجود زندگی کی ساری عمارت کو اس بنیاد پر کھڑا کیا کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ صرف مادہ ہے۔ نمو، حرکتِ ارادی، احساس، شعور اور فکر سب اسی ترقی یافتہ مادہ کے خواص ہیں۔ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو طبعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور سے ترتیب پاتے ہیں، اسی قسم کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اختیار اور کوئی ارادہ نہیں۔ تہذیبِ جدید کے معماروں نے اسی فلسفہ کو سامنے رکھ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی عمارت تعمیر کی۔ ہر تحریک جس کا آغاز اس مفروضہ پر کیا گیا کہ کوئی خدا نہیں۔ کوئی الہامی ہدایت نہیں، کوئی واجب الاطاعت نظام اخلاق نہیں۔ کوئی حشر نہیں اور کوئی جوابدہی نہیں، ترقی پسند تحریک کہلائی۔ اس طرح یورپ کا رُخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف پھر گیا۔ خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات و ذہنیت، اخلاق و اجتماع، علم و ادب، حکومت و سیاست، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں الحاد اس پر پوری طرح غالب آ گیا۔ اگرچہ یہ سب کچھ تدریجی طور پر ہوا اور ابتداء میں تو اس کی رفتار بہت سست تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس طوفان نے سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

فلسفۂ الحاد نے جس برق رفتاری سے دنیا میں ترقی کی۔ اس کی بڑی وجہ لبرلزم (Liberalism) ہے۔ آغاز میں تو اس تحریک نے محض اس لیے سر اٹھایا تھا کہ اس کے ذریعہ عوام کے ذہنوں کو مذہب اور کلیسا کے بندھنوں سے آزاد کرایا جائے۔ اس لحاظ سے یہ نہایت ہی اچھی تحریک تھی۔ اس نے لوگوں میں احساس اور شعور پیدا کیا۔ انہیں حالات پر غور و فکر کرنا سکھایا۔ انہیں یہ بتایا کہ وہ کن کن مظالم کا شکار ہیں، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس آزاد خیالی نے ذہنی انارکی کی شکل اختیار کر لی اور اب روشن خیالی کے یہ معنی قرار پا گئے ہیں کہ انسان کو ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہونا چاہیئے۔ خواہ وہ مذہب کی عائد کردہ ہو یا سماج کی۔ اس لبرلزم کی عملی انتہا یہ تھی کہ ہر وہ چیز جو پہلے سے چلی آتی ہو، وہ چاہے اپنے اندر صداقت و افادیت کے کتنے ہی پہلو رکھتی ہو، اسے بہر حال رد کر دینا اور اس کے مقابلہ میں کوئی انوکھی اور نئی بات کہنا ہی روشن خیالی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس نظریہ کا اثر اس قدر ہمہ گیر تھا کہ زندگی کے تمام شعبے اس سے متاثر ہوئے[۵]۔

تہذیب الحاد کا دوسرا عنصر ترکیبی مادیت (Materialism) ہے۔ اسے مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں مادہ کے سوا کوئی چیز نہیں۔ . . . .

. . . حتیٰ کہ انسان بھی صرف برقیہ اور سالمیہ ہی کی کرشمہ سازی ہے۔ اسے اس دنیا میں اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ صرف مادی احتیاجات کی تسکین ہے۔ اس نقطہ تک پہنچنے کے لیے کافی مدت صرف ہوئی۔ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد کچھ مدت تک مادی زندگی اور مسیحی اعمال و رسوم کو جمع کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ مذہب کی پیروی سے وہ پوری طرح آزاد ہونا نہیں چاہتے تھے، اور اسی بات کے آرزومند تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح کم از کم زندگی کے پرائیویٹ معاملات میں مذہبی رسوم کی ضرور پابندی کریں۔ ان کا خیال تھا کہ اسی سے قوم کے افراد کے درمیان ربط قائم رہ سکے گا اور اس طرح ملک اجتماعی انتشار اور اخلاقی ابتری سے محفوظ رہے گا۔ لیکن مادی تہذیب کا ریلا اتنا تیز تھا کہ اس کے سامنے مذہب اس کمزور حیثیت میں کھڑا نہ رہ سکا، اور وقت کے دھارے کی نذر ہو کر رہ گیا اور اس کی جگہ مادہ پرستی نے لے لی۔ مصنفین، اہل علم اور اہل دماغ گروہ ہونے

۵- Harold Laski = The Rise of European Liberalism

اپنی جادو بیانی، سحر طرازی، اور زورِ خطابت سے قدیم مذہبی رسوم اور قیود کے خلاف ملک میں ایک عام بغاوت برپا کر دی۔ انہوں نے دنیا پرستی کو نہایت ہی دلفریب بنا کر پیش کیا۔ جو چیز اس کی راہ میں حائل ہوئی۔ اس کے خلاف غیظ و غضب کا جذبہ بھڑکایا اور اس طرح طبیعتوں کو ہر قسم کی قید و بند سے آزاد کر دیا۔ انہیں زندگی سے بھرپور تمتّع، مطالبات نفس کی بے عنان تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی۔ حرص و ہوائی اس زندگی کی اہمیت جتلانے میں بڑے غلو سے کام لیا گیا۔ نقد لذت اور ظاہری اور محسوس مادی نفع کے سوا ہر چیز کا ابطال کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کا موجودہ مذہب صرف مادہ پرستی ہے۔ اس کے متعلق ایک مفکر نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے :۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو دینی طریقہ پر سوچتے ہیں۔ اور مذہبی احساس رکھتے ہیں، اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیب کی روح کے ساتھ منطبق کرنے میں امکانی کوشش بھی کرتے ہیں۔ مگر یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں۔ یورپ کا عام اور متوسط آدمی خواہ وہ جمہوریت پر ایمان رکھتا ہو یا فاشزم پر، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، جسمانی مشقت کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا، وہ ایک ہی مذہب رکھتا ہے اور وہ مادی ترقی کی پرستش ہے۔ اور اس کی غایتِ حیات صرف یہی ہے کہ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان، پُر راحت، اور عام محاورے کے مطابق قدرت سے آزاد بنا سکے۔ اس مذہب کے معابد بڑے بڑے کارخانے، کیمیاوی دارالصنعت، ناچ گھر اور بجلی کے مراکز ہیں۔ اس مذہب کے پیشوا بینکوں کے افسر، انجینئر، اداکار، بڑی بڑی صنعتوں کے ناظمین اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں۔ لذت اور طاقت کی اس ہوس اور چھچھورپن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حریف گروہ سامان جنگ سے لیس اور جنگی تیاریوں سے مکمل تیار کھڑے ہیں۔ تاکہ جب کبھی ان کے مصالح میں تصادم ہو تو وہ بغیر کسی تاخیر کے ایک دوسرے کو تباہ کر دیں۔ اور جہاں تک تمدن کا تعلق ہے۔ انسانوں کا ایک ایسا گروہ جنم لے چکا ہے جن کے نزدیک نیکی اور اخلاق کا اصل پیمانہ صرف فائدہ ذاتی ہے۔ اور ان کے ہاں بھلائی اور برائی کو جانچنے کا اصل معیار صرف مادی کامیابی ہے۔"

بہت ممکن ہے کہ اس بیان کو زیادہ وقعت نہ دی جائے ، کیونکہ ان خیالات کا پیش کرنے والا اسلامی افکار سے متاثر ہے ۔ اس لیے ہم ذیل میں چند دوسرے مفکرین کی آراء پیش کرتے ہیں ۔ ان سے اس رجحان کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ پروفیسر جوڈ کہتے ہیں ۔

" صدیوں سے انگلستان کے تخیل پر دولت اندوزی کا اصول غالب ہے ۔ حصول دولت کی خواہش پچھلے دو سو سال سے دیگر محرکات عمل سے زیادہ اور بڑھ کر کار فرما رہی ہے ۔ کیونکہ دولت حصولِ ملکیت کا ذریعہ ہے ۔ اور ذاتی ملکیت کی بہتات اور عظمت و شان سے انسان کی قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ سیاسیات ، ادب ، سینما ، ریڈیو اور کبھی کبھی گرجاؤں کے منبروں سے سال ہا سال سامعین کو یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ مہذب قوم وہی ہے جس میں تملیکی جذبہ انتہائی ترقی کر چکا ہو"[1]

لن یوٹانگ (Linyutong) ایک چینی مفکر نے دورِ جدید کی مادہ پرستی کا نقشہ اپنی کتاب " آنسوؤں اور ہنسی کے درمیان " (Between tears and laughter) میں ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

" اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ معاشی طرزِ فکر نے تمام دوسرے افکار پر غلبہ پا لیا ہے ۔ اور اس زمانہ میں معاشی معاملات دوسرے تمام معاملات کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں ۔ ہم اس وقت معاشیات کے لگائے ہوئے چرکوں پر معاشیات ہی کا مرہم لگانے کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتے ۔ ہماری زندگی کا سب سے بڑا مقصد صرف ایک اچھا کاروبار ہے ۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نفع اندوزی اور حصول قوت کا نصب العین آئندہ جنگ کا اہم ترین محرک ہے ۔ ہمارا دور ایک ایسا دور ہے جس میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا بالکل دیوالہ نکل چکا ہے ۔ ہمارے افکار پر مادیت پرستی کا غلبہ ہے "

یہی مصنف ایک دوسری جگہ لکھتا ہے :-

---

[1] The Philosophy of our Times

"ہمارے افکار کا تانا بانا مادیت ہی سے بنا گیا ہے . . . ہمارے ذہنوں میں جنت کا تخیل بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ یہ ایک ایسا گودام ہے جس میں مال ہی مال بھرا ہوا ہے۔ اس وقت پوری دنیا ایک کاروبار ہے ۔۔ سیاسی کاروبار یا معاشی کاروبار ۔۔ ایک قوم ایک کارخانہ اور ایک حکومت وہ میز ہے جس پر لین دین کیا جاتا ہے۔ اور اس کے سیاستدان اس کارخانہ کے سیلز مین ہیں، جو ہر وقت اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ اپنے مال کو دوسری منڈیوں میں اوروں کی نسبت زیادہ سے زیادہ فروخت کریں۔"[1]

اس مادیت پرستی کا یہ اثر ہے کہ اس زمانے میں انسان صرف حصول زر اور جلب منفعت کے لیے زندہ ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ بھی سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ پروفیسر جوڈ نے بالکل سچ کہا تھا:

"جو نظریۂ حیات اس زمانہ پر مستولی اور غالب ہے۔ وہ اقتصادی نظریہ ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں ہر مسئلے اور معاملے کو پیٹ یا جیب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا اور جانچنا"

زر پرستی کے اس جنون نے سب سے زیادہ نقصان اخلاقی قدروں کو پہنچایا ہے۔ چونکہ اب سب سے بڑا مقصد صرف دولت ہی حاصل کرنا ہے اس لیے اس کا حصول سب سے بڑی نیکی ہے۔ دورِ جدید کی کتاب اخلاق میں بھلائی وہ ہے جس سے مادی فوائد و لذائذ حاصل ہوں۔ اور برائی نام ہے ان طریقوں کا جن سے ان میں کمی آتی ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اخلاق کی وہ معروضی قدریں جو انسانیت کے مختلف گروہوں اور طبقوں میں کسی نہ کسی حد تک توازن قائم رکھتی تھیں وہ مٹ چکی ہیں۔ اور ان کی جگہ مصلحت پرستی نے لے لی ہے۔ اور یہی مصلحت پرستی اس عہد کا سب سے خطرناک فتنہ ہے۔

الیکسس کیرل (Alexis Carrel) نے اپنی کتاب "انسان نامعلوم" (Man the Unknown) میں کہا ہے:-

---

[1] Linyutong: Between tears and laughter, p. 62

" ہماری تہذیب کی یہ مادہ پرستی نہ صرف فکرِ انسانی کی صحیح پرواز میں حائل ہوئی ہے بلکہ اس نے غور و فکر کو بھی ختم کر دیا ہے۔ اس نے شریف انسانوں، کمزوروں اور بے سہارا لوگوں اور ایسے تمام انسانوں کو جو دولت کے علاوہ کوئی اور مطمح زندگی رکھتے ہوں، نیست و نابود کر دیا ہے "

عدا بیزار فلسفۂ زندگی کے مفاسد کا احساس ؟ بعد از خرابئ بسیار اب یورپ کے مختلف مکاتبِ فکر میں تیزی سے پیدا ہو رہا ہے۔ مشہور اخبار نویس (LOIUS FISCHER) نے اپنی کتاب عظیم تحدی (THE GREAT CHALLENGE.) میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے :-

" عہدِ جدید کے فتنہ کی اصل وجہ یہی ہے کہ انسان کے پیشِ نظر کوئی اصول نہیں، بلکہ محض نفع ہے۔ اس لیے وہ ظلم و عدوان کے ہاتھوں میں بالکل بک گیا ہے۔ سیاسی میدانوں میں وقتی مصالح اور حب الوطنی اُن اصولوں سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ عوام کی غایتِ حیات اپنے اعتقادات پر کاربند ہونا نہیں، بلکہ ان کا منتہائے مقصود صرف اپنی اپنی حکومتوں کی پیروی کرنا ہے اور تباہی و بربادی کی اصل وجہ یہی ہے "

اخلاقی قدریں آجکل محض مقیاس الحرارت کے پارہ کی سی حیثیت رکھتی ہیں، جو واقعات کے ساتھ ساتھ ہر لحظہ بدلتی رہتی ہیں۔ وہ کوئی آخری، حتمی اور قطعی معیار نہیں، جن کے مطابق انسان اپنے اعمال و افکار کو جانچ سکے۔ ان کی اہمیت آجکل صرف اسی قدر ہے کہ وہ ہر قول اور ہر فعل کے لیے، خواہ وہ کتنے ہی ذلیل مقاصد کے لیے کہا اور کیا جائے، وجہ جواز فراہم کریں۔ انسان جو ذلیل سے ذلیل کام کرنا چاہے، کر سکتا ہے۔ اخلاقیات کا کام صرف اسی قدر ہے کہ وہ اس کی ہر رذالت پر ٹھپہ لگا کر اسے خوش آمدید کہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم پروفیسر سارکن (Prof: Sorokin) کی کتاب (The Crisis of our Age) میں سے چند اقتباسات بھی پیش کر دیں :-

" موجودہ نظام کے حسی اخلاقیات نے انسان کو کافی حد تک ذلیل کر دیا ہے۔ اخلاقی

قدریں بالکل مٹ گئی ہیں۔ ان کی حیثیت آج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اگر ان سے کسی کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر وہ اس راہ میں مزاحم ہوں تو ان کو بلا تکلف ترک کر دیا جاتا ہے۔ انسان نے آج مصلحت پسندی کو اپنا شعار بنا لیا ہے، اور اس طرح انہوں نے دنیا میں مستقل کشمکش اور عناد کے بیج بو دیئے ہیں۔ جب ہمارے اخلاقی معیار ہی باہم متصادم ہوں تو اخلاقی قدریں بھی لامحالہ دفن ہو کر رہ جائیں گی۔ ان حالات میں انسانوں پر باہمی کرخت کا دھیلا پڑ جانا بالکل فطری ہے۔ مسیحیت کے اصول "الفت" کی جگہ اب "نفرت" نے لے لی ہے۔ اب فرد اور فرد کے درمیان منافرت ہے۔ اور ایک گروہ دوسرے گروہ سے برسرپیکار ہے۔ قومیں قوموں کے خلاف، ریاستیں ریاستوں کے خلاف اور نسلیں نسلوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ آج اس کا نتیجہ یہ ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" ایسے مذموم اصول کی پوری دنیا پر فرماں روائی ہے۔"

"اس وقت شاید ہی کوئی اخلاقی قدر ایسی ہو جو اشتراکی اور سرمایہ دار، ہٹلر کے پیرو اور یہودی، انگریزی اتحاد اور جرمن اتحاد، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ، امراء اور غرباء کے درمیان مشترک ہو۔ اخلاقی معیار ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک جو کچھ بھلائی ہے وہی دوسرے کے خیال میں برائی ہے۔ اور سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ جدید فلسفہ کے ہاں کوئی ایسا پیمانہ نہیں جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ . . . لہٰذا ہم ایک دوسرے سے برسرپیکار افراد کا ایک ایسا گروہ ہیں جن کے پاس عدل و انصاف کا کوئی ترازو نہیں۔ اس کا نتیجہ اخلاقی انارکی کے سوا کچھ ہو سکتا تھا، اور نہ فی الواقع ہے۔ ہر شخص خود اپنا قانون ساز ہے۔ اور ہر کوئی اپنے پیش کردہ معیار کو ہی صحیح تسلیم کرتا ہے۔"

یہی مصنف موجودہ جنگ و جدال کی وجوہ کا تجزیہ کرتا ہوا ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"چونکہ جسمانی مسرت، افادیت اور حسی لذت ہر فرد اور گروہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اور جہاں تک چاہے، ان کو

حاصل کرنے کی سعی کرے جنسی خواہشات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کی تسکین کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ جہاں جسمانی لذت کے چند لوازم فراہم کرنے کے لیے اَن گنت لوگ بیتاب ہوں وہاں ان کا کمیاب ہو جانا ناگزیر ہے۔ اور ان کی کمیابی ہی عہدِ حاضر کی جنگ و جدال کا سب سے بڑا سبب ہے۔ ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ جنگ و جدال زیادہ شدید صورت اختیار کرے[1]۔"

یہ ہے مغربی تہذیب کے اثمار میں سے ایک ثمر جس کی تلخی کا خود اہلِ مغرب کو بھی اب شدید احساس ہو رہا ہے۔

تہذیبِ الحاد کا تیسرا عنصر حاکمیتِ جمہور ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ ایک قوم کے عوام اپنی خواہشات اور اپنی آرا میں ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ وہ جس شے کو چاہیں، کثرتِ آرا سے اپنے لیے خود حلال یا حرام ٹھیرا سکتے ہیں۔ مذہب و اخلاق کا کوئی ضابطہ ان کے فیصلے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ کسی ریاست کی اصل قوت کا انحصار وہاں کے عوام پر ہوتا ہے اس لیے اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا ہے کہ حاکمیت بھی انہی کی ہونی چاہیے۔ اس فلسفے کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ اس نے حاکم اور محکوم کی دوئی کو مٹا دیا ہے۔ اب عوام ہی حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی۔

فرانسیسی انقلاب سے پیشتر حاکمیت بادشاہوں یا مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اگرچہ اپنے معاملات میں کافی حد تک آزاد تھے، مگر پھر بھی ان پر چند پابندیاں عائد تھیں۔ انگلستان کے دستور میں چند دفعات ایسی تھیں جو ان کے فرماں روائی طرف سے من مانی کارروائیاں کرنے کی راہ میں حائل ہوتی تھیں۔ اسی طرح دوسرے ممالک میں بھی رائے عامہ کا دباؤ شہنشاہوں کے عزائم پر کافی حد تک دخل انداز تھا، اور انہیں اپنی خواہشات کی بے قید پیروی سے کسی حد تک روک دیتا تھا۔ مگر اس نئے نظریہ نے کہ حاکمیت کے اصل مالک ملک کے عوام ہی ہیں، فرمانرواؤں پر اس قسم کی تمام پابندیوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔ اب عوام خود مختار ہیں کہ وہ جو چاہیں کریں۔ کوئی چیز ان کی راہ نہیں روک سکتی

[1] Sorokin The Crisis of our Age

اور اگر یہ کہا جائے کہ مغربی تہذیب کا سب سے بڑا کرشمہ یہ ہے کہ اس نے حاکمیت کو بھی ہر قسم کے بندھنوں سے آزاد کر دیا ہے تو یہ بیجا نہ ہوگا۔

بظاہر یہ نظریہ نہایت ہی معقول معلوم ہوتا ہے۔ اسی کی رو سے عوام کو بادشاہوں کے ظلم وستم سے نجات حاصل ہوئی۔ انہیں یہ حق نصیب ہوا کہ وہ اپنی بہتری کے لیے ہر قسم کی تدابیر اختیار کرسکیں مگر حاکمیت کو عوام کے ہاتھوں میں اس طرح دے دینے کے بعد بھی انسانیت کے حقیقی مصائب ختم نہیں ہوئے۔ اس فلسفے کی اصل اساس یہ ہے کہ عوام کی مرضی ہی اصل حاکم ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کی مرضی کو کس طرح معلوم کیا جائے۔ ہر فرد کی رائے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ اتنی متضاد آرا میں سے ایک ایسی رائے کا تلاش کرنا جو سب کے لیے قابل قبول ہو، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ رائے عامہ سے مراد سارے عوام کی رائے نہیں بلکہ ملک کی اکثریت کی رائے ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کا اندازہ کس طرح لگایا جاسکتا ہے۔ ایک شخص کے لیے جو سماج میں رہتا ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ اپنی صحیح صحیح رائے بغیر کسی دباؤ کے بیان کر دے۔ الفریڈ کابن Alfred Cobbon نے اپنی کتاب The Crisis of Civilization میں کہا ہے :۔

"کسی قدیم قوم کے لیے اپنی رائے کا عملی طور پر مظاہرہ کرنا ممکن تھا۔ لیکن اب کثرتِ آبادی کی وجہ سے جتنے گروہ بڑھتے جائیں گے، اتنا ہی ایک فرد کے لیے یہ مشکل ہوگا کہ وہ اپنی رائے کے مطابق عمل کرے۔ اور اس تناسب سے متضاد آرا بھی معرض وجود میں آئیں گی اس لیے اس کی عملی شکل سوائے نمائندگی کے اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ یہ مسئلہ ماہرین نفسیات کی سمجھ سے بالا ہے کہ وہ، چار یا آٹھ کروڑ انسانوں کی رائے کی صحیح طور پر کس طرح ترجمانی کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تک کوئی ایسا سیاسی منتر بھی دریافت نہیں ہوسکا، جس کے ذریعے چار کروڑ افراد کی آراء کا اظہار کیا جاسکے۔ ان حالات میں جبکہ نمائندگی کا پورا

لے روسو نے اسے General will کا نام دیا ہے۔

نظام ـــ مثلاً الیکشن، پارٹیاں، کابینہ ـــ عوام اور آخری حکمران رائے کے درمیان حائل ہو، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ عوام کی صحیح رائے معلوم کی جا سکے۔ مختلف سیاسی جماعتوں کا مختلف سیاسی نظریات کے ترجمان کی حیثیت سے جنم لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ سماج میں مختلف مفادات پائے جاتے ہیں۔ اور کسی ایسی سوسائٹی کا تصور بھی ناممکن ہے جس میں سارے افراد کے مفادات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں۔ ان حقائق کے ہوتے ہوئے اگر ہم ایک ریاست کے لیے ایک ہی رائے کے طالب ہوں تو یہ سوائے ایک پارٹی اسٹیٹ یا ایک فرد کی حکومت کے ممکن نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ نظام نمائندگی (Representative system) رائے عامہ (General will) پیدا کرنے میں سخت ناکام ہوا ہے۔ اور یہ اسی کی ناکامی کا نتیجہ ہے کہ لوگوں نے ایک "آمر" کی رائے میں رائے عامہ کی تلاش کی۔ آمریت دراصل جمہوری نظریہ "رائے عامہ" کا منطقی اور طبعی نتیجہ ہے۔ اس ساری بحث کو دو فقروں میں سمیٹا جا سکتا ہے یعنی "جمہوریت اس بات کی متقاضی ہے کہ کوئی صحیح رائے عامہ (General will) ہو۔ اور اس رائے عامہ کے تجریدی تخیل (Abstract idea) کو جب کسی ٹھوس شکل میں منتقل کیا جاتا ہے تو اسی میں سے منطقی طور پر آمریت ابھر آتی ہے[1]۔"

یہ آمریت ضروری نہیں کہ کسی فرد واحد ہی کی ہو۔ یہ ایک پارٹی یا ایک گروہ کی بھی ہو سکتی ہے۔ البتہ جو چیز ان سب کے درمیان قدر مشترک کی سی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ حاکمیت کو ہاتھ میں لے چکنے کے بعد افراد اور گروہ اپنے آپ کو بالکل غیر مسئول سمجھتے ہیں۔ اور زندگی اس طرز پر گزارتے ہیں، گویا وہ کائنات کے بلا شرکت غیرے حاکم اور مالک ہیں۔ کائنات اور اس میں جو کچھ ہے وہ سب انہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اسے جس طرح چاہیں استعمال کریں اور کوئی ان کو ٹوکنے یا پوچھنے کی جرأت نہ کرے۔ الفریڈ کابن نے بالکل درست کہا ہے کہ عوام کو حاکمیت کا سونپ دیا

---

[1] Alfred Cobban : the Crisis of Civilization p. 67

جانا ان کو وہی حقوق عطا کر دیتا ہے جو "حقوقِ ربانی" کے نظریہ (Divine right of kings) کی رو سے ازمنۂ وسطیٰ میں بادشاہوں کو حاصل تھے۔ اور اس طرح جن جن بے اعتدالیوں کے پہلے بادشاہ مرتکب ہوتے تھے، انہی بے اعتدالیوں کا ارتکاب آج حاکمیتِ جمہور کے نام پر دنیا کا عیار طبقہ کر رہا ہے۔

اس تہذیبِ الحاد کا ایک اور خطرناک عنصر حیوانی ازدواج کا فلسفہ ہے۔ اس فلسفہ نے اخلاقی قدروں کے آثار تک کو مٹا ڈالا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد جب مزدور طبقہ سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر جینے لگا تو اُسے اس امر کا احساس ہُوا کہ وہ تنہا پورے خاندان کی کفالت کا بار نہیں اُٹھا سکتا۔ چنانچہ وہ اس بات پر مجبور ہُوا کہ گھر سے بچوں اور عورتوں کو بھی فیکٹریوں میں گھسیٹ کر لے آئے تاکہ وہ اور اس کے بال بچے جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھ سکیں۔ اس تغیر نے سب سے زیادہ صنفِ نازک کو مضطرب کیا۔ وہ ترقی پسندی کے باوجود شرم و حیا کے لباس کو کسی صورت بھی اپنے جسم سے علیحدہ کرنے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ مگر اس آڑے وقت میں فلسفی کام آئے۔ انہوں نے فوراً آگے بڑھ کر اُس کے کان میں یہ آواز دی "یہ شرم و حیا اور عصمت و عفت جن کی تو قدر کرتی ہے سب اضافی چیزیں ہیں جو زمانہ کے ساتھ برابر بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی حیثیت ماضی کے افسانوں سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ درحقیقت یہ سنہری جال ہیں جو تمہارے آباؤ اجداد نے تمہارے لیے تیار کر رکھے تھے۔ مگر اب تمہیں ہوش میں آنا چاہیے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم ان بوسیدہ رسیوں کو توڑ ڈالو اور ان سے آزادی حاصل کرو۔ تم ہر لحاظ سے مرد کے برابر ہو، لہٰذا تمہیں زندگی کی دوڑ دھوپ میں اس کا شریک ہونا چاہیے۔ اس باطل فلسفہ کا اثر یہ ہُوا کہ پہلے تو نکاح کی گرفت ڈھیلی ہوئی، اُس کے بعد نکاح سے ایک عام بیزاری کا رجحان پرورش پانے لگا۔ مالتھس (Malthus) کے نظریۂ آبادی" نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور خاندانی نظام کی مضبوط عمارت پیوندِ خاک ہو گئی۔ اس کی تباہی نے انسانی سوسائٹی پر جو اثرات ڈالے اُن کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ بچوں کی تربیت اور نگہداشت سے عام لاپروائی۔

(ب) صنفی انارکی۔

اس سلسلہ میں مناسب یہ ہے کہ ہم اسی تہذیب کے چند سربرآوردہ داعیوں کی آراء پیش کریں تاکہ معلوم ہوسکے کہ وہ خود اس کے متعلق کس طرز پر سوچتے ہیں۔ پروفیسر سارو کن کہتا ہے:۔

"عہدِ ماضی میں ایک خاندان بچوں کی تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا اور اہم ذریعہ تھا۔ آج سے ایک سو سال پہلے بھی بچوں کی زیادہ تر تعداد اسی سے فیض یاب ہوتی تھی لیکن دورِ جدید میں خاندان کا دائرہ اثر بہت حد تک سکڑ گیا ہے۔ جن گھرانوں میں بچے نہیں ہوتے اُن کے ہاں تو تربیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر جن خاندانوں میں اولاد ہوتی ہے وہاں بھی اُن کی تربیت کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا جاتا۔ بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد ہی گھر کے ماحول سے نکال کر نرسری سکولز، کنڈرگارٹن، پرائمری سکولز کے حوالہ کر دیا جاتا ہے اس طرح سے خاندان کے وجود کا ایک اہم مقصد فوت ہوگیا ہے۔"

اس کے بعد وہ لکھتا ہے:۔

"انسان محض حیاتیاتی وجود ہی نہیں رکھتا جس کا اپنا کوئی رجحان نہ ہو، بلکہ وہ بہت سے میلانات رکھتا ہے۔ اس لیے کوئی ذریعہ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو ان میلانات کو صحیح طور پر نشوونما دے سکے۔ پہلے اس فرض کو خاندان سرانجام دیتا اور بچوں کو اجتماعی زندگی کے لیے کارآمد بناتا تھا، مگر آج کل خاندان اس اہم فرض کی بجا آوری میں غفلت برت رہا ہے۔ اس کوتاہی کی اصل وجہ یہ ہے . . . کہ ایک ایسا خاندان جس میں خاوند اور بیوی کے تعلقات کسی مضبوط بنیاد پر استوار نہ ہوں وہاں بچوں کی صحیح طور پر تربیت نہیں ہو سکتی۔ جس کی وجہ سے بچوں میں اچھی صفات پیدا ہونے کی بجائے بہت سی اخلاقی کمزوریاں اُبھر آتی ہیں۔ ایسے خاندانوں میں پرورش پانے والے بچے بالعموم کم ظرف، تُنک مزاج اور منافق ہوتے ہیں۔ اگر باہر کے تعلیمی ادارے تربیت کی اس کمی کو پورا کر سکتے تو پھر بھی کچھ بات تھی، مگر وہ ایسا نہیں کر سکے۔ ایک ان پڑھ ماں جس میں شفقت اور ذہانت موجود ہو

وہ ان سکولوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کے مقابلہ میں بہتر معلمہ اخلاق ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ مجرمین، فساق اور فجار کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اب دنیا میں ایسے افراد پیدا ہو رہے ہیں جو نہ تو کسی مضبوط سیرت کے مالک ہیں اور نہ انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے[1]"

اسی طرح عہد جدید کے ایک دوسرے مفکر (Alexis Carrel) نے بھی خاندانی نظام کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے لکھا ہے:

"موجودہ سماج نے سب سے فاش غلطی یہ کی ہے کہ اس نے تربیت کے لیے خاندان کے مقابلہ میں مدرسوں پر اعتماد کیا۔ آج کی ماں اپنے بچہ کو نرسری سکول میں صرف اس غرض کے لیے چھوڑ دیتی ہے تاکہ وہ اپنی معاش کے لیے، آزاد شہوت رانی کے لیے، فضول قسم کی آرٹ پرستی کے لیے اور برج کھیلنے یا سینما جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت بچا سکے اور اس طرح ایک قسم کی مشغول بیکاری (busy idleness) میں منہمک رہے۔ اس طرز زندگی نے خاندانی نظام کو، جس کے زیر اثر رہ کر بچہ بہت کچھ سیکھتا ہے، بالکل درہم برہم کر دیا ہے۔ ایک بچہ اپنی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کو ماحول کی مدد سے ہی صحیح طور پر نشو و نما دے سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی حد تک الگ تھلگ بھی رہے، مگر خاندان کے افراد کی توجہ کا مرکز بھی ہو[2]"

خاندانی نظام کی بنیادوں کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے خاندان کے چھوٹے افراد کے دلوں میں بڑوں کا احترام ختم ہو گیا ہے اور اسی طرح بڑوں کے دلوں میں بھی چھوٹوں کے لیے کوئی شفقت باقی نہیں رہی۔ آج بیوی اور خاوند اور باپ اور بیٹے کے درمیان اگر کوئی رشتہ ہے تو وہ صرف معاشی ہے اور اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو دوسرا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ مغربی

---

[1] The Crisis of our Age, p. 190

[2] Alexis Carrel= Man the Unknown

تہذیب کے ایک نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے :-

"اس زمانہ کی جگہ جس میں خاندانی روابط کا استحکام ہی خاندان اور قبیلہ کی خیر و فلاح کے لیے ضروری تصور کیا جاتا تھا، مغرب جدید میں ایک ایسے زمانہ نے لے لی ہے جو وسیع تر عنوانات کے ماتحت اجتماعی تنظیم کرتا ہے۔ ایک ایسی سوسائٹی ہیں جو بنیادی طور پر صنعتی ہے، اور جس کی تنظیم بڑی تیز رفتاری کے ساتھ خالص میکانکی خطوط پر کی جا رہی ہے، ایک فرد کا اپنے باپ کے ساتھ برتاؤ کوئی معاشرتی اہمیت نہیں رکھتا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپین باپ کا اپنے بیٹے پر اقتدار ہر آن کم ہو رہا ہے۔ اور اسی طرح بیٹے کے دل میں اپنے باپ کی طرف سے عزت و احترام کا جذبہ رو بہ زوال ہے۔ ان کے باہمی تعلقات تیزی کے ساتھ قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں اور عملاً ایک ایسی مشینی سوسائٹی کے ذریعہ ان تعلقات کا خون ہو رہا ہے جس میں افراد کے باہمی حقوق کے منسوخ کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے اور جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خاندانی رشتہ داری کے مقرر کیے ہوئے حقوق بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔"[1]

حیوانی ازدواج کے اس فلسفہ نے جہاں ایک طرف خاندانی نظام کو تباہ اور برباد کیا ہے وہاں اُس نے Back to Nature کے رنگین پردے میں پوری دنیا میں اباحیتِ مطلقہ (صنفی انارکزم) کا بیج بو دیا۔ اُس نے لوگوں کو نہایت ہی دلچسپ انداز میں یہ درس دیا کہ آزاد محبت عین تقاضائے فطرت ہے۔ یہ نکاح وغیرہ کی پابندیاں محض مصنوعی ہیں اور تاریخ کے تاریک ادوار کی یادگار ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کا ہر ہوٹل، ہر پارک، ہر کوارٹر عصمت فروشی کا اڈا بن گیا ہے۔ یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ اور تو اور خود اس تہذیب کے پرستاروں نے اس کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کر دی ہے۔ ہم اس وقت اس موضوع پر کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ صرف چند مغربی مفکرین کی شہادتیں پیش کرتے

[1] Islam at the Cross Road

ہیں۔ ان سے ہوا کے رخ کا صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکیگا۔ یورپ کا مشہور مفکر برٹرینڈ رسل اپنی کتاب "اجتماعی تعمیر نو کے اصول" میں لکھتا ہے :-

"ہماری سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں سب سے زیادہ ابتری اس طبقے کے اخلاق میں پیدا ہو رہا ہے جو ہمارے لیے زیادہ مفید اور زیادہ کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ ایک یقینی امر ہے کہ اگر ہمارا معاشی اور اخلاقی نظام اسی طرح قائم رہے تو آئندہ دو یا تین نسلیں اپنے اخلاق و کردار کے اعتبار سے انتہائی خراب نکلیں گی اور یہ مسئلہ صرف ہمیں ہی نہیں بلکہ تمام مہذب ممالک کو در پیش ہے اور زیادہ صحیح الفاظ میں اس مسئلہ کا تعلق پوری مغربی تہذیب سے ہے"

اسی طرح علم طبیعیات کی ایک ماہر عورت مسز ٹیسن کی رائے بھی قابل ذکر ہے۔ وہ کہتی ہے :-

"ہماری تہذیب کی عمارت کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ اس کی بنیادوں میں تعفن آگیا ہے اور اس کے شہتیر ہل رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ ساری عمارت کب پیوند خاک ہو جائے ہم گزشتہ کئی سال سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ اب لوگ نظم و ضبط کی پابندیوں کو اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے تقاضی بس ایک ہی صورت باقی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول پر پابندی عائد کر دی جائے۔ کیونکہ اس تہذیب کے لوگوں کی تمام تر توجہات آزاد جنسی تعلقات، قحبہ گری اور عصمت فروشی مختصر یہ کہ جنسی خواہشوں پر مرتکز ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے ان کی ساری تعمیری صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ اس معاملہ میں اور بھی طرح طرح کی بے اعتدالیاں دیکھنے میں آتی ہیں جیسے مردوں اور عورتوں کا خود اپنے ہی ہم جنسوں کی طرف مائل ہونا۔ انسانی صلاحیتوں کا یہ زیاں بڑا ہی تشویشناک ہے۔

جنسی تعلقات کی یہ نوعیت اور اس کے ان بد ترین آثار اور نتائج کو دیکھ کر ہمارے ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ آیا یہ ہماری تہذیب کے ملیا میٹ ہونے کے آثار و شواہد

ہیں یا اس کے اسباب - میری یہ رائے ہے کہ یہ آثار و شواہد بھی ہیں اور اسباب بھی"[1]

امریکہ اور انگلستان میں اس اخلاقی انحطاط نے سب سے زیادہ خطرناک صورت اختیار کی ہے - پچھلے سال امریکہ میں ایک کتاب شائع ہوئی جس کا نام (U. S. A. Confidential) ہے - اس کتاب کے مصنفین نے امریکی زندگی کا ایسا گھناؤنا نقشہ پیش کیا ہے جس کے تصور سے بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے - اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف مارچ ۱۹۵۲ء میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے - مغربی تہذیب کے اس گہوارہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :-

"اب جبکہ ہم اپنے گرد و پیش پر نگاہ ڈالتے ہیں تو حالات یکسر بدلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں - آج ہمارے ہاں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی افراط ہے - اب عورتوں کو آزادی ہے اس لیے وہ ہمارا پیچھا کرتے ہیں بھی آزاد ہیں . . . مردوں کی چشم التفات ان کے لیے ایک ایسی جنس نایاب ہے جس کے لیے انہیں سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے . . .

آپ کو طبیعوں کے ہاں جانے کی ضرورت نہیں، آپ ٹیلیفون پر انہیں گھر بلا سکتے ہیں - اس تغیر نے اس پیشہ کے معاشی پہلو میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا ہے - اب نہ تو مکانوں کی ضرورت ہے اور نہ سرمائے کی - چکلوں میں سوائے نچلے طبقہ کے کوئی نہیں جاتا . . . .

طبیعوں کو اب کمپنی گرلز (company girls) کے لقب سے مخاطب کیا جاتا ہے - ان سے سارا معاملہ ڈاکٹر کی طرح فون پر ہی طے ہو جاتا ہے - اور ڈاکٹروں کی طرح ہی انہیں مہینے کے آخر میں بل کی ادائیگی کر دی جاتی ہے - بعض لوگ انہیں کال گرلز (Call girls) یا پارٹی گرلز کے ناموں سے بھی موسوم کرتے ہیں - کیونکہ ضرورت کے وقت انہیں دعوتوں میں مدعو کیا جاتا ہے - یہ مہذب رنڈیاں تلاش روزگار میں ایک

[1] Sex & Commonsense

ریاست سے، دوسری ریاست میں جاتی رہتی ہیں۔"

"صحبت ہم جنس (Homo Sexuality) جس کا رواج زیادہ تر مردوں میں تھا اب عورتوں میں عام ہو رہی ہے۔ کوئی بیوقوف انسان ہی قوم کی اس ابتر اخلاقی حالت کو نظر انداز کر سکتا ہے:"

قریب قریب یہی حال انگلستان کا بھی ہے۔ (Pat Solan) لنڈن کی اخلاقی حالت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:-

"ایک شخص کے لیے یہ قطعاً ناممکن ہے کہ وہ لندن کے مرکزی بازار میں سے گزر جائے اور کوئی خاتون اس کو "خوش آمدید" نہ کہے۔ اگر قارئین مجھ پر اعتماد نہ کریں تو میں انہیں آج بھی اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ وہ گیارہ بجے رات کے بعد پیکاڈلی، لیسبرز سکوئر، اور ریجنٹ سٹریٹ میں سے شام کے وقت گزر کر دیکھیں۔ انہیں میرے اس دعوے کی صداقت کا خود بخود یقین ہو جائے گا۔"

روس بھی اسی مرض کا شکار ہے۔ اشتراکیت نے وہاں اخلاقی سطح کو اور بھی پست کر دیا ہے۔ اشتراکی راہنماؤں نے زیادہ زور صرف اسی ایک بات پر دیا ہے کہ کوئی چیز بھی اشتمالی سوسائٹی میں رکاوٹ نہ بننے پائے۔ جنسی عمل میں انسان کو اس کے مذاق اور طبیعت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور آزاد جنسی تعلقات کی استواری کے کلی اختیارات اسے تفویض کر دیئے گئے ہیں۔

اس آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے شہروں میں جہاں اشتراکی اخلاقیات اور اباحیت مطلقہ کا براہِ راست اثر پڑا وہاں جنسی انارکی نے اخلاقی اقدار کو بالکل مٹا ڈالا۔

مشہور اشتراکی اخبار پراودا (Pravada) میں اب سے کچھ سال پیشتر اشتراکیوں کی جنسی آزادی پر ایک مضمون چھپا تھا جس میں صاف الفاظ میں لکھا گیا تھا کہ محبت کے بارے میں ہمارے نوجوان چند خاص اصول رکھتے ہیں اور ان اصولوں کی تہ میں یہ تخیل کارفرما ہے کہ جس قدر تم حد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گے، یا بالفاظ دیگر جس قدر زیادہ تم حیوانیت سے قریب تر ہو گے، اسی قدر زیادہ تم اشتراکی

ہوگئے لیبر فیکلٹی کا ہر ممبر، ہر طالب علم خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس بات کو اصولِ متعارفہ میں سے شمار کرتا ہے کہ محبت کے معاملات میں جہاں تک ممکن ہو اس کو اپنے اوپر کوئی قید عائد نہ کرنی چاہیئے۔ اس طرح کے اصولِ متعارفہ میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ ہر لڑکی جو لیبر فیکلٹی میں داخل ہے اس پر لازم ہے کہ جب اُس کے نوجوان ساتھیوں میں سے کسی کی نظرِ انتخاب اس پر پڑے تو وہ بلا حیل وحجت اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دے۔[1]

اسی طرح ایک ممتاز روسی سائنس دان انٹون نیمیلوف (Nemilov) جو اشتراکیت کا بڑا پُر جوش حامی ہے، اپنی کتاب "عورت کا حیاتیاتی حزنیہ" (The Biological Tragedy of Woman) میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ مرد و روں میں صنفی انار کی عالمگیر ہو گئی ہے۔ پیٹ سلون نے اپنی ایک ممتاز تصنیف "روس بے نقاب" (Rusia without Illusion) میں ان عورتوں کا تذکرہ کیا ہے جو روس میں زنا کو اپنا پیشہ بناتے ہوئے ہیں، اور اجنبی مسافروں اور سیاحوں کی تاک میں رہتی ہیں۔ اُس کے دیئے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق صرف ماسکو میں ۲۰۰ بازاری عورتیں ہیں۔

بد معاشی کے یہ جراثیم صرف کارخانوں، شہروں اور یونیورسٹیوں میں ہی نہیں بلکہ زراعتی فارموں تک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ موریس ہندس ایک اجتماعی فارم کے حالات بطورِ مثال کے پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> "ایک مرد اور عورت اس فارم میں ملازم ہوئے۔ شوہر کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ تین ہفتوں کے قیام کے بعد اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور ایک گوالن سے شادی کر لی۔ چند ہی دنوں کے بعد وہ ایک دوسرے ساتھی کی بیوی سے زنا کرتا ہوا پکڑا گیا۔"

روسی لٹریچر میں اس قسم کی اَن گنت مثالیں مل سکتی ہیں۔ ہم طوالت کے خوف سے انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان میں جو کچھ بتانا ہمیں مقصود ہے وہ صرف یہی ہے کہ مغربی تہذیب نے دنیا کے تمام

---

[1] بحوالہ ترجمان القرآن جلد ۱۲ عدد ۱۔

ممالک میں ایک ہی قسم کے جنسی تعلقات کو جنم دیا ہے۔ پروفیسر ساروکن پوری دنیا کی اخلاقی پستی کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے:۔

"ہم کھانا اب ہوٹلوں اور ریستورانوں میں کھاتے ہیں۔ ہماری روٹی بیکری سے آتی ہے، کپڑے لانڈری میں دھلتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں تفریح کے لیے لوگ خاندانوں کی طرف رجوع کرتے تھے لیکن اب اس کے لیے سینماؤں، تھیٹروں اور کلبوں کا رُخ کیا جاتا ہے۔ پہلے خاندان ہماری دلچسپی کا مرکز تھا اور خاندانی زندگی ہی میں سکون تلاش کیا جاتا۔ مگر اب خاندان کے افراد بکھر گئے ہیں۔ اور اگر کچھ مل کر رہتے بھی ہیں تو اس کا مقصد فوت ہو گیا ہے۔ وہ دن کا زیادہ وقت اکیلے فکرِ معاش میں بسر کرتے ہیں۔ رات کا وقت جس میں کہ خاندان کے افراد اکٹھے ہوتے تھے وہ بھی اب علیحدگی میں گذرتا ہے۔ اب ہمارے گھر ہمارے لیے استراحت کی جگہ نہیں رہے جہاں ہم بہرحال شب باش ہوں۔ شب باشی کا تو ذکر ہی کیا، اب تو ایک پوری رات بھی لوگ اپنے گھر میں بسر کرنا پسند نہیں کرتے۔"[۱]

اس تہذیب الحاد کا ایک اور زہریلا عنصر قوم پرستی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں مسیحیت اگرچہ ایک زندہ اور متحرک قوت کی حیثیت سے مر چکی تھی مگر اس کا مزار اب بھی پورے یورپ کی اجتماعی زندگی کا مرکز و محور تھا۔ اس میں زندگی کے آثار مٹ جانے کے بعد بھی اتنی کشش باقی تھی کہ لوگ اسی کے اصولوں میں فوز و فلاح تلاش کرتے۔ اس کے اعلیٰ اور ارفع نصب العین اور اس کے بلند و برتر اجتماعی تخیل نے مختلف قوموں اور نسلوں کو جوڑ رکھا تھا۔ مگر جب لوتھر نے اپنی مشہور اصلاحی تحریک شروع کی اور رومی کلیسا کی مخالفت میں جرمن قوم کو اُبھارا اور بالآخر کلیسا کو اس کے مقابلہ میں شکست دیکھنا پڑی، تو قومیں جس شیرازہ میں بندھی ہوئی تھیں اس کی بندش ٹوٹ گئی اور اس طرح ان کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ اب ان میں سے ہر ایک نے اپنی خودمختاری کا علم بلند کر دیا۔ اس کے بعد یورپ کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس اجتماعی تخیل کے ختم ہو جانے کے بعد

---

[۱] P.A. Sorokin = The Crisis of Our Age

انسانوں کے سامنے کونسا ایسا نصب العین پیش کیا جائے جس کی محبت لوگوں کے اندر سعی و طلب کا ولولہ پیدا کرے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے تہذیبِ الحاد قوم پرستی کی مدح کو سامنے لائی۔ اہلِ یورپ خدا کے انکار کے باوجود کسی ایسے معبود کے متلاشی تھے جس کے سامنے وہ جبینِ نیاز جھکا سکیں۔ دُنیا کی بدقسمتی کہ یہی وہ زمانہ تھا جب مغرب کا ذہین دماغ بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اس سے مشینیں چلانے میں کامیاب ہوا، اور مشینوں کی کثیر پیداآوری اور تیز رو پیداآوری نے یورپ کی بیشتر قوموں کے سامنے تیار شدہ مال کی کھپت کی پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ اُن کے اپنے عوام اس مال کو خریدنے کی قوت نہ رکھتے تھے چنانچہ اس مال کو فروخت کرنے کے لیے منڈیوں کی جستجو ہونے لگی۔ اور یورپ کی بہت سی قومیں اسی مقصد کے حصول کے لیے اپنے گھروں سے نکل پڑیں۔ اس تگ و دو میں مسابقت کے جذبہ کا اُبھرنا ایک فطری امر تھا۔ مگر اسی مسابقت نے باہمی رقابت کی صورت اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف سلطنتوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس آڑے وقت میں جس نظریہ نے لوگوں کو سرگرم عمل کیا اور اُنہیں لڑنے مرنے پہ اُبھارا وہ نیشنلزم کا نظریہ تھا۔ مغربی دلوں نے اس نئے بُت کے تراشے جانے کے بعد کسی قدر اطمینان محسوس کیا۔ ایک اَن دیکھے خدا کی پرستش کی جگہ پیشانیاں اب اس پیکرِ محسوس کے سامنے جھکنے لگیں۔ اور انسان اپنی زندگی میں بندگی کا جو خلا محسوس کر رہا تھا وہ اس طرح پورا ہو گیا فرد فرد میں یہ احساس اُبھرنے لگا کہ اس کی ساری سرگرمیوں کا محور قوم کا مفاد ہے۔ اس نئے استھان پر اُسے سب کچھ بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ سادہ لوح عوام پر یہ جادو چل گیا چنانچہ یورپ کی ساری قومیں قوم پرستی کے نشہ میں بدمست ہو کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں۔ مشہور انگریز فاضل لارڈ لوتھین نے مسلم یونیورسٹی کے خطبۂ اسناد میں اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

"جب لوتھر کی تحریک نے (جس کو دینی اصلاح کی تحریک کہا جاتا ہے) یورپ کی ثقافتی اور دینی وحدت کا خاتمہ کر دیا تو یہ براعظم مختلف قومی حکومتوں میں بٹ گیا اور ان کے

جھگڑے اور مقابلے دنیا کے لیے ایک دائمی اور مستقل خطرہ بن گئے۔"

دینی انحطاط، دینی اصول و اخلاق کی نسبت سے قومیت اور وطنیت کے طرزِ خیال کو جو فروغ ہوا، اس کی طرف بھی لارڈ موصوف نے اس خطبہ میں متوجہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"دین جو انسان کا ضروری رہنما، اخلاقی مقصد کے حصول اور انسانی زندگی کی عزت اور معنویت کا واحد ذریعہ ہے، اس کے اقتدار کے زوال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی دنیا ایسے سیاسی مذاہب و خیالات کی گرویدہ بن گئی جن کی بنیاد نسل اور طبقات کے اختلاف پر ہے۔"

آغاز میں اس نئے دین کے سب سے بڑے مبلغ اور پُرجوش حامی صرف وہی لوگ تھے جو صنعتی انقلاب سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر دولت کے بل پر مسندِ اقتدار پر قابض ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے اس نظریہ کی توسیع و اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور چند سال میں اسے دنیا کا مقبول ترین نظریہ بنا دیا۔ پروفیسر ہیرلڈ لاسکی (Harlod Laski) نے اپنی کتاب "یورپ میں آزادیٔ افکار کا عروج" (The Rise of European Liberalism) میں ان اسباب کا تجزیہ کیا ہے جن کی وجہ سے تمام دنیا کا سرمایہ دار طبقہ اس نظریہ کا حامی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ایک تاجر قوم پرستی کے نظریہ کا اس لیے خیر مقدم کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے ذریعہ ملک کے اندر کامل اتحاد و اتفاق ہونے کی وجہ سے امن امان قائم ہوگا۔ اور اس طرح وہ پُرسکون فضا میں پوری جمعیتِ خاطر سے تجارت کر سکے گا۔ دوسرے اسے ہم پیشہ لوگوں کی انجمنوں (Guilds) کے قوانین و ضوابط سے آزادی نصیب ہو گی۔ وہ دل و جان سے اس بات کا متمنی ہے کہ مذہب و کلیسا کے اقتدار کا خاتمہ ہو۔ کیونکہ اس کے کمزور پڑ جانے سے حلال و حرام کی قیود بھی ختم ہو جاتی ہیں۔"

سرمایہ داروں کے اس گروہ نے نہایت ہی عیاری سے لوگوں کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ تجارت کے فروغ میں دراصل کسی ایک طبقہ یا گروہ کا فائدہ نہیں بلکہ پوری قوم کا فائدہ[1] ہے۔ اس لیے

---

[1] بعض ناواقف لوگ ابھی تک قوم پرستی کو حب الوطنی کا ہم معنی خیال کرتے ہیں۔ مگر یہ زبردست غلط فہمی ہے۔ (باقی صفحہ ۱۲۶ پر)

اُسے چاہیے کہ قوم کی سربلندی کے لیے وہ دوسروں کو شکست دے۔ اسی مذموم خیال کو فلسفہ کے جس رنگین لباس میں پیش کیا گیا۔ وہ ایک نہایت ہی دلچسپ داستان ہے۔

دَورِ متوسط میں مادہ سے جو حیرت انگیز کام لیا گیا اُس نے انسان کے ذہن میں اس خیال کو راسخ کر دیا کہ دُنیا کے سارے مظاہر میں صرف مادّہ ہی جلوہ گر ہے۔ اس کے بعد زندگی کے متعلق یہ نظریہ ترقی پانے لگا کہ یہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اگر بات یہیں تک رہتی تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ مگر اس سے یہ غلط اصول مستنبط کیا گیا کہ دُنیا میں اصل حق "کل" (Whole) ہے۔ اور افراد یا اشیاء کا علیحدہ وجود سراسر باطل۔ اس اصول نے انفرادیت کی بالکل نفی کر دی۔ پھر عقل کے اندھوں نے پوری دنیا کو ایک "کل" سمجھنے کی بجائے اپنے اپنے ملک اور قوم کو کل سمجھا اور لوگوں کو مختلف طریقوں سے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنی انفرادیت کو اس کل کے بحرِ بیکراں میں غرق کر دیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ عوام نے اپنا سب کچھ اسی دیوی کے قدموں میں لا کر ڈال دیا اور عبادت و تقدیس کا جتنا تعلق عبد و معبود کے درمیان ہونا چاہیئے تھا انہوں نے اس خود ساختہ معبود کے ساتھ قائم کر لیا۔ انسان کے سامنے سب سے بلند مقصد یہ ٹھہرا کہ وہ خود کو قوم کے اندر بالکل تحلیل کر دے۔ مسولینی اس خیال کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے :-

"افراد اور گروہوں کے مقابلہ میں اقتدارِ اعلیٰ کی اصل مالک صرف قوم ہے۔"

یہی نہیں بلکہ قوم نے اپنے لیے اس مرتبہ کا دعویٰ کیا جو مذہب میں شارع کو دیا گیا ہے۔ قوم خطا و نسیان سے معصوم ہے۔ اس سے لغزش اور غلطی کا صدور ممکن نہیں۔ تمام افراد اس کی ملک ہیں اور ان پر اس کی اطاعت فرضِ عین ہے۔ اس کو حق ہے کہ جس اَمر میں جو چاہے فیصلہ کرے۔ فرد کی پہلی اور آخری وفاداری صرف قوم کے لیے ہے۔ اور اس میں کوتاہی کفر سے کم نہیں۔ پروفیسر جوڈ نے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۵) جس کا شکار بعض اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی نظر آتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ حب الوطنی ایک مثبت داعیہ ہے اور اس لحاظ سے بالکل فطری ہے۔ مگر قوم پرستی ایک منفی تحریک ہے، جو لوگوں کے اندر دوسری قوموں کے خلاف نفرت کے جذبات کو اُبھارتی ہے۔

ہر فرک، جرمن وزیر داخلہ، کا یہ بیان نقل کیا ہے:۔

"قوم کا مفاد ہی دراصل حق کا سب سے بڑا معیار ہے۔ حق وہ ہے جس سے جرمن قوم کو نفع حاصل ہو اور باطل وہ ہے جس سے جرمن قوم کو نقصان پہنچے"۔

چنانچہ جرمنی کی کتاب الایمان کا کلمۂ شہادت یہ قرار پایا:۔

"ہٹلر کی خدمت جرمنی کی خدمت ہے اور جرمنی کی خدمت، اللہ کی خدمت ہے"۔

فکر و نظر کی یہ تبدیلی صرف داخلی پالیسی میں واقع ہوئی۔ جہاں تک خارجی پالیسی کا تعلق ہے اس کے نتائج کہیں زیادہ مہلک ثابت ہوتے۔ مختلف قوموں اور ملکوں نے اپنے سیاسی مقصد اور استعمار کے جو چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچ لیے، ان کی حدود سے باہر نکل کر سوچنا ان کے لیے قریب قریب ناممکن ہو گیا۔ انہوں نے ہر اس چیز کو باطل خیال کیا جو ان کی خاک وطن سے تعلق نہ رکھتی تھی اس قوم پرستانہ ذہنیت اور غیر ملکی چیز کے خلاف عصبیت یہاں تک بڑھ گئی کہ قوموں نے کسی غیر ملک سے آئی ہوئی اعلیٰ قدروں کو بھی ماننے سے انکار کر دیا جن کو خدا کے پاک بندوں نے وقتاً فوقتاً پیش کیا تھا اور جن میں کسی ایک قوم یا ملک کے مفاد کی حفاظت مقصود نہ تھی بلکہ پوری نوع انسانی کی فلاح مطلوب تھی۔ جرمنی کے ایک پروفیسر اٹرنے کے یہ الفاظ اس ذہنیت کی پوری طرح غمازی کرتے ہیں:۔

"ہمارے بچے کیوں ایک غیر قوم کی تاریخ پڑھیں، انہیں کیوں ابراہیم اور اسحاق کے قصے سنائے جائیں۔ ہمارا خدا جرمنی ہونا چاہیے"۔[1]

پھر اس خیال نے کہ حق انہی کی میراث ہے قوم کے اندر نخوت اور تکبر کے جذبات پیدا کیے۔ انہوں نے یہ طے کر لیا کہ جینے اور پھلنے پھولنے کا حق اگر کسی کو ہے تو وہ صرف ان کی اپنی قوم کو ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سراسر باطل ہے اس لیے اس کو مغلوب اور محکوم رہنا چاہیے۔ مسولینی نے ۱۹۲۵ء میں تقریر کرتے ہوئے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

"اگر یورپ اب دنیا میں اپنا استعماری مشن پھیلانے کے قابل نہیں رہا تو یقیناً

[1] بحوالہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" از مولانا ابوالحسن علی ندوی

اس کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ . . . وحشیوں اور حبشیوں کے اب یہ حوصلے ہو گئے ہیں کہ مجلس اقوام کی عدالت میں آکر ان عظیم الشان قوموں کے خلاف استغاثہ کریں جو عالم انسانیت میں انقلاب برپا کر چکی ہیں۔"

ہٹلر اپنی مشہور کتاب "میری جدوجہد" میں لکھتا ہے:۔

"دنیا میں علوم و آداب، فنی کمالات، و فوائد کا جو بیش قیمت سرمایہ پایا جاتا ہے اس کو چند مخصوص قوموں کی ذہانت و کمال اور قوت ایجاد نے پیدا کیا ہے۔ اور یہ تمام قومیں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر ہم نوع انسانی کی تین اقوام قرار دیں۔ (۱) علم و تہذیب پیدا کرنے والے (۲) ان کی حفاظت کرنے والے (۳) انکو تباہ کرنے والے، تو پہلی قسم میں صرف آرین نسل آئے گی۔"

دنیا کی ہر قوم نے نہ صرف اپنے آپ کو دوسروں سے بلند و برتر خیال کیا بلکہ اپنے اجتماعی وجود کا سب سے بڑا مقصد یہ سمجھا کہ وہ دوسروں کو دنیا سے مٹا دے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے اندر ایسے احساسات ابھارے جائیں جن کی وجہ سے قوم کے افراد کے دلوں میں دوسروں کے خلاف اس قدر شدید نفرت پیدا ہو جائے کہ وہ ان کا نام تک سننا گوارا نہ کریں، اور ہمیشہ انہیں ملیا میٹ کر دینے کی فکر میں رہیں۔ اس کام کو بڑے منصوبے کے تحت سرانجام دیا گیا۔ ماہرین نفسیات نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ دوسروں کے خلاف نفرت و عداوت اسی صورت میں پھیلائی جا سکتی ہے کہ ملک کے ماہرین تعلیم اور سیاسی لیڈر اپنی قوم کے بچوں میں خوف، و ہراس کے احساسات کو پرورش دیں۔ ان میں تعلیم و تربیت کے ذریعہ، پریس اور ریڈیو کی مدد سے اس خیال کو ابھارا جائے کہ دوسری قومیں تمہاری دشمن ہیں۔ وہ تمہیں تاخت و تاراج کرنے کا عزم رکھتی ہیں علیٰذا تمہارا فرض ہے کہ تم کامل اتحاد و اتفاق سے ان کے خلاف صف آرا ہو جاؤ اور ان کے حملہ کرنے سے پہلے ہی تم اتنی قوت سے ان پر یلغار کرو کہ ان کا قومی وجود باقی نہ رہے۔ پروفیسر جوڈ لکھتا ہے:

"مشترک جذبات جن کو آسانی سے برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور جو جمہور کی بڑی بڑی جماعتوں کو باہم متحد بنا سکتے ہیں وہ شفقت و مودت، فیاضی اور محبت کے جذبات نہیں بلکہ

نفرت اور خوف کے جذبات ہیں۔ انہی کی مدد سے مسند اقتدار حاصل کی جاتی ہے۔ پچھلے الیکشن جن نعروں سے جیتے گئے وہ یہ تھے: قیصر کو تختہ دار پر لٹکا دو اور جرمنی کو مجبور کرو کہ وہ تاوان جنگ ادا کرے۔ ایک مشہور لیڈر نے مجھ سے خود بیان کیا کہ اس نے ۱۹۱۸ء کے انتخاب میں صرف اس لیے شکست کھائی کیونکہ اس کا مخالف چھ جرمنوں کو ایک ہی پستول سے مارنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ لہٰذا جو گروہ کسی قوم پر کسی مقصد کے لیے حکومت کرنا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس کے لیے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کریں جس سے وہ نفرت کرے اور اس سے لیے کوئی شخصیت یا قوم نہ پیدا کریں جس سے وہ ڈرے۔ اگر مجھے وقتی دورِ جدید کی مختلف اقوام کا اتحاد مطلوب ہے تو مجھے چاہیے کہ میں ان کے لیے کسی اور سیارہ پر کسی دشمن کا وجود تلاش کروں۔ اس بنا پر یہ قطعاً حیرت کی بات نہیں کہ اس زمانہ کی قومی حکومتیں اپنی ہمسایہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت نفرت و حقارت کے زیر اثر رہیں۔ انہی جذبات پر ان سلطنتوں کی زندگی موقوف ہے۔ اور انہی جذبات پر قومی اتحاد کی بنیاد ہے۔[۱]

اس سلسلے میں ایک عجیب بات جو دیکھنے میں آئی ہے وہ یہ کہ دنیا کی ہر قوم یا نسل اپنے مخالف میں اس قسم کے جذبات کو نہایت ہی نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس کے نزدیک اگر یہ احساسات کسی غیر کے اندر موجود ہوں تو نہایت ہی برے ہیں۔ مگر جب انہی خیالات کی پرورش خود اپنی نسل یا قوم میں کی جائے تو یہی گمراہ کن نظریات صالح افکار میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل (Bertrand Russel) اپنی ایک مشہور کتاب میں لکھتا ہے:[۲]

"ہر شخص اس بات سے متفق ہے کہ دوسرے ممالک کی قوم پرستی ایک نہایت ناپسندیدہ اور نفرت انگیز جذبہ ہے مگر یہی جذبہ جب ان کی اپنی قوم کے اندر پرورش پاتا ہے تو یہ شرمناک یا حیرت انگیز نظر آنے لگتا ہے اور جرأت قبول نہیں کرتا وہ قوم کے اندر ذلیل و حقیر ہوتا جاتا ہے۔"

۱؎ Joad: A Guide to Modern Wickedness

۲؎ Bertrand Russel: New Hopes for the Changing World p. 69

نیشنلزم کے اس نظریہ کے اندر فساد کے جو بیج دبے ہوئے ہیں وہ ریشہ دوانیوں، وعدہ خلافیوں، کمزور آزاریوں اور جنگی تصادموں اور چالبازیوں کی شکل میں اُگ آئے۔ اس نازک صورتِ حالات نے مغربی زندگی کو بالکل بے اطمینان کر دیا ہے۔ فاتح اور مفتوح دونوں اپنی بربادیوں پر غور کرتے ہیں اور بار بار اس عالمگیر فساد کو ختم کرنے کے متعلق سوچتے ہیں۔ اس غرض کے لیے جمعیت اقوام کی بنا رکھی جاتی ہے مگر تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ یہ اپنے مقاصد میں ہمیشہ ناکام رہی ہے۔ امیر شکیب ارسلان نے بالکل درست کہا تھا کہ شاعری کی بحر کی طرح اسم بے مسمیٰ غیر قانونی کارروائیوں کو قانونی جامہ پہنانے اور فتوحات کو ناموں کے تغیّر سے جائز قرار دینے کے علاوہ اس کے وجود کی اور کوئی غرض نہیں۔ اس کا سارا زور صرف اسی ایک بات پر صرف ہوتا ہے کہ وہ کمزوروں کو دبائے اور دست درازوں اور طاقتور سلطنتوں کے مظالم کے لیے وجہ جواز فراہم کرے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ "بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند" اس کے نصب العین کے بالکل صحیح ترجمان ہیں۔ (باقی آئندہ)

(بقیہ سنتِ رسولؐ از صفحہ ۱۳۱)

اب میں پھر اپنی پہلی بات کی طرف آتا ہوں، یعنی یہ کہ کوئی ٹھوس دلیل ہونی چاہیئے اس بات کی کہ خوارج نے حدیثیں گھڑی ہیں، مگر اس کم میں اب تک، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، کوئی ایسی دلیل نہیں پا سکا۔ اور ایسا ممکن بھی ہو کیونکر ۔ ۔ ۔ امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ: "گمراہ فرقوں میں سب سے زیادہ صحیح حدیث بیان کرنے والے خوارج ہیں" امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "گمراہ لوگوں میں خوارج سے زیادہ سچے اور عادل لوگ نہیں مل سکتے" انہی کے بارے میں امام موصوف ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: "یہ لوگ قصداً جھوٹ نہیں بولتے بلکہ سچائی میں مشہور ہیں اور ان کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ یہ لوگ اصدق الحدیث ہیں"

یہ وضع حدیث کا پہلا سبب تھا، آئندہ ہم دوسرے اسباب سے بھی بحث کریں گے (باقی آئندہ)

(بقیہ سنتِ رسولؐ)

تو سمجھ لو کہ میرا فعل ہے" یہ روایت غلط اور بے بنیاد ہے۔

زکریا ساجی نے یحیٰی بن معین کی روایت اس طرح نقل کی ہے کہ "یہ حدیث زنادقہ کی ایجاد ہے"

ان دونوں روایتوں میں خوارج کا کہیں ذکر نہیں ہے، اور بعض لوگ اس حدیث کو مستبعد بھی خیال نہیں کرتے، محض ضعیف قرار دیتے ہیں۔

میری دلی خواہش تھی کہ کوئی علمی دلیل ہاتھ لگے، جس سے اس امر کی تائید حاصل ہو سکے کہ خوارج بھی وضعِ حدیث کا ارتکاب کرتے تھے۔ مگر پوری چھان بین کے باوجود میں نے تمام علمی حقائق کو اس کے برعکس پایا، ان سے کوئی الزام خوارج کے سر پہ نہیں آتا، بلکہ ان کی پوزیشن اور زیادہ صاف ہوتی ہے۔ خوارج سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ آنحضورؐ کی طرف کوئی غلط بات منسوب کر دیں گے جب کہ وہ گناہ کبیرہ یا محض گناہ کے ارتکاب کو کفر خیال کرتے تھے اور جھوٹ کبائر میں داخل ہے، مبرد اپنی کتاب کامل (۲/۱۰۶) میں لکھتا ہے کہ "خوارج کے تمام فرقے جھوٹ بولنے اور معصیت کا ارتکاب کرنے والے سے براءۃ کا اور بے تعلقی کا اظہار کرتے تھے، ان کا سوادِ اعظم خالص عربی النسل تھا، یہ لوگ شیعہ سے اس لحاظ سے مختلف تھے کہ ان کے اندر زنادقہ یا نسل پرستوں کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی، ان لوگوں میں عبادت کا گہرا جذبہ پایا جاتا تھا، یہ لوگ جاں نثار اور مخلص تھے، مداہنت سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا، اور نہ انہیں فتنہ جوئی کی عادت تھی —— شیعہ گروہ میں یہ تمام خرابیاں موجود تھیں —— جس گروہ کی یہ خصوصیات ہوں اس سے جھوٹ کا صدور ناممکن ہے۔ اگر یہ لوگ آنحضورؐ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کے جواز کے قائل ہوتے، تو لازماً بعد کے خلفاء، امراء اور حجاج بن یوسف اور زیاد بن سمیہ جیسے سرکش حکمرانوں پر بھی اتہام طرازی کرتے، لیکن اس وقت ہمارے پاس جو تاریخی سرمایہ موجود ہے، وہ محض یہ حقیقت پیش کرتا ہے کہ ان لوگوں نے ان حکمرانوں، خلفاء اور امراء کا بڑی جرأت، بے باکی اور سچائی کے ساتھ مقابلہ کیا، اس کے بعد آخر جھوٹ کی کون سی ضرورت باقی رہتی ہے۔

(باقی صنا۳ پر دیکھیے)

(بقیہ اشارات)

لیکن یہاں ایک دوسری مصیبت پیش آجاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تقویٰ کے متعلق بالعموم لوگوں کا نقطۂ نظر بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ بیشتر اصحاب کے نزدیک تو تقویٰ سے مراد محض لباس، وضع قطع، نشست برخاست، اکل و شرب وغیرہ امور کے متعلق اس ظاہری نقشہ پر اپنی زندگی کو ڈھال لینا ہے جس کے جزئیات احادیث میں بیان ہوئے ہیں، نیز چند مذہبی اعمال کی پابندی کرنے اور معمول سے کچھ زیادہ عبادات کر لینے سے تقویٰ کی تکمیل سمجھی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے تقویٰ کی اس ظاہری شکل کو اختیار کر لیا ہے انہیں متقی کہا اور سمجھا جاتا ہے اور وہ خود بھی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اندر تقویٰ پیدا کر لیا ہے، حالانکہ فی الحقیقت روح تقویٰ کی ان میں بہت کمی ہوتی ہے اور بسا اوقات عملی زندگی کی آزمائشوں میں ایسی ایسی غیر متقیانہ حرکات ان سے سرزد ہو جاتی ہیں جن کی بدولت تقویٰ کی اس ظاہری شکل کا بھرم بھی جاتا رہتا ہے۔ اس عام تصور سے بلند تر اور وسیع تر تصور تقویٰ جو خواص میں پایا جاتا ہے وہ بھی اس سے زیادہ نہیں ہے کہ انفرادی زندگی میں آدمی خدا ترس، عبادت گزار اور ذاکر و شاکر ہو، معاملات میں دیانت، امانت، راستبازی اور حدود اللہ کا پابند ہو، اور دوسرے افراد کے ساتھ معاشرت میں خوش اخلاقی، ہمدردی، مواساۃ، انصاف اور حق رسانی کے طریقہ پر عامل رہے۔ اس محدود تصور میں وسیع تر اجتماعی مسائل کے فہم و ادراک کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لیے ہمارے بہترین صلحاء کے ہاں بھی جو تزکیۂ نفس کیا جاتا ہے اس کا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ خدا کی باغی حکومتوں کو پرہیزگار رعیت اور متدین ملازم بہم پہنچ جائیں۔ خود ان کی تعلیم و تربیت جیسی رعایا اور جیسے ملازم فراہم کرتی ہے ان میں اور تو سب قابلیتیں ہوتی ہیں، مگر ایمانداری اور راست بازی نہیں ہوتی اس لیے وہ ان کا اچھا خاصا نقصان بھی کر دیتے ہیں۔ یہ کمی ہمارے ہاں کے تزکیۂ نفس کیے ہوئے افراد سے پوری ہوتی ہے۔ جو غلبۂ کفر کے لیے لڑنے اور نظام کفر کو چلانے کے لیے راستباز آدمی مہیا کرتے ہیں اور کفر کی حکمرانی کے لیے وہ رعیت پیدا کرتے ہیں جو اس کے لیے کم سے کم موجب پریشانی ہوتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ہمارے ہاں اگر کوئی شخص کھلم کھلا کسی غیر الٰہی نظام کے قیام میں جان لڑا رہا ہو تب بھی وہ جوں کا توں متقی رہتا ہے بشرطیکہ اس کی زندگی میں تقویٰ کے وہ جزئیات پائے جاتے ہوں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ یہ سب لازمی نتائج ہیں اس محدود تصور کے جو ہمارے مذہبی طبقوں میں تقویٰ اور تزکیۂ نفس کے متعلق خواص سے لیکر عوام تک پھیلا ہوا ہے۔

مطبوعات

(اس اشاعت میں ہم چند اہم انگریزی کتابوں کا تعارف پیش کرتے ہیں)

دنیا کی زمام کار اس وقت اہل مغرب کے ہاتھوں میں ہے اور وہی پوری نوع انسانی کو علمی و فکری غذا فراہم کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اسلامی دعوت کے علمبرداروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ دورِ جدید کے رجحانات اور میلِ عام تحریکات سے اچھی طرح واقف ہوں۔

مغربی تہذیب کے بارے میں جو چیز پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی ترقی اب تنزل کے آغوش میں دم توڑ رہی ہے۔ مغربی مفکرین آج اس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ یورپ کو تباہی اور بربادی سے کس طرح بچایا جائے۔ سائنس کے کمالات نے اہل مغرب کے سامنے طریقِ پیدائش کی نئی نئی گرہیں تو کھول دی ہیں مگر انسانیت کے راز ان پر افشا نہیں کیے۔ وہ مادی سامان کی فراوانی کے باوجود آج مضطرب ہیں۔ اور اسی اضطراب کا اظہار وہاں کے متعدد اصحابِ فکر نے کیا ہے۔ ہم آج ان صفحات میں انہی میں سے چند لوگوں کے خیالات پیش کرتے ہیں:-

۱- ہمارے عہد کا بحران (The Crisis of our Age) مصنف پ۔ا۔ سارو کن P.A. Sorokin ضخامت ۳۳۸ صفحات۔

یہ کتاب پہلی بار نیویارک میں شائع ہوئی اور اکتوبر ۱۹۴۱ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک اس کے نو ایڈیشن نکل گئے۔ اس کا مصنف ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبہ عمرانیات کا صدر ہے۔ اس سے پہلے وہ عمرانیات کے بین الاقوامی ادارہ کا صدر تھا۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے نہایت ہی ٹھوس اور واضح دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن پر اب نزع کا عالم طاری ہے، اور یہ مصیبت جس میں کہ وہ اپنے آپ کو اس وقت گرفتار پاتا ہے کوئی آفتِ ناگہانی نہیں ہے بلکہ یہ ایک فطری نتیجہ ہے اس فکر کا جسے یورپ

نے پچھلے دو سو سال میں جنم دیا۔ اس عالمگیر فساد کا ذکر جن الفاظ میں اُس نے کیا ہے وہ اس قابل ہیں کہ اُن پر نہایت ہی ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔

وہ کہتا ہے:-

"بدیہی شہادتوں کے پیش نظر مجھے اس بات کا پوری طرح اطمینان ہو گیا ہے کہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ، ہماری تنظیم، ہماری سوسائٹی ایک زبردست بحران سے گزر رہے ہیں۔ جسم کا کوئی حصہ، قلب، دماغ کا کوئی ریشہ رایسا نہیں جو صحیح طور پر کام کر رہا ہو۔ سارے بدن میں ناسور ہیں۔ ہم اس وقت ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جس کے ایک طرف ماضی کا حسّی تمدن ہے اور دوسری طرف مستقبل کا تصوری تمدن۔ ہم چھ سو سال گزارنے کے بعد اب زندگی کے آخری سانس لے رہے ہیں۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی بھولی بھٹکی کرنیں اگرچہ دنیا کو منور کر رہی ہیں مگر رات کے تاریک سائے بھی ہر لحظہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس شفق میں جبکہ سورج کی بصارت میں کمی واقع ہو گئی ہے ہمارے لیے اپنے آپ کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ تاریک رات نوع انسانی کو اپنے ڈراؤنے پروں میں چھپانے کے لیے منتظر ہے۔ ... مگر اس تاریکی سے بہت دور تصوری تمدن کی صبح بھی مستقبل کے انسان کے انتظار میں کھڑی مسکرا رہی ہے۔"

فاضل مصنف نے نہایت ہی دیدہ وری کے ساتھ اپنے زمانہ کی خرابیوں اور خامیوں کا احساس کیا ہے۔ اس کی وطن پرستی اندھی نہیں، روشن ضمیر ہے۔ وہ دورِ حاضر کی فنی اور صنعتی ترقی اور سائنس کے کمالات سے خیرہ چشم ہو کر کسی خوش فہمی میں گرفتار نہیں ہوا بلکہ اس نے اپنی قوتِ تنقید کو بیدار رکھا ہے اور ایک ایکس رے ایکسپرٹ کی طرح فساد کے ان مرکزوں کی نشاندھی کی ہے جو اگرچہ دنیا کی نظروں سے مستور ہیں مگر نوع انسانی کے جسم کو بیمار اور اس کے خون کو گندا کر رہے ہیں۔ اس کے نزدیک یہ فساد ہمہ گیر ہے۔ اور زندگی کے رگ و پے میں پوری طرح سرایت کر چکا ہے۔ لہٰذا دورِ جدید کا سب سے اہم مسئلہ یہ نہیں کہ نظامِ حکومت کا ظاہری ڈھانچہ کس شکل کا ہونا چاہیے بلکہ سب سے ضروری سوال

یہ ہے کہ فساد کی ان جڑوں کو کس طرح تبدیل کیا جائے، جن سے شر کی یہ ساری کونپلیں پھوٹتی اور غذا حاصل کرتی ہیں۔ وہ پورے زور سے کہتا ہے:

"دورِ حاضر کے بحران کی اصل وجہ یہ نہیں کہ اس عہد میں ہٹلر، مسولینی، سٹالن یا چرچل نے جنم لیا۔ یہ لوگ تو اس بحران کی پیداوار ہیں۔ ان کو دنیا کے سٹیج سے ہٹا دینے سے فساد کا خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ ان کے ہٹنے کے ساتھ ہی ان سے زیادہ شریر لوگ ان کی جگہ پر قابض ہو جائیں گے۔ اگر ہم واقعی اصلاحِ حال چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے فکر و نظر کے زاویوں کو بدلنا چاہیے۔ یہ تبدیلی اُسی صورت میں ممکن ہے جبکہ لوگوں میں اپنی تباہی و بربادی کا ایک شدید احساس پیدا ہو۔ کیونکہ یہ احساس ہی لوگوں کو انقلاب کے لیے سرگرمِ عمل کر سکتا ہے۔"

اس کے علاوہ وہ لوگوں کی اس غلط فہمی کو بھی دور کرتا ہے جس کا شکار ہو کر لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس حسّی تمدّن کے علاوہ کوئی جامع تہذیب نہیں۔ اُس نے پوری وضاحت سے یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ اس تہذیبِ الحاد کے مقابلہ میں ایک ایسا نظامِ حیات بھی ہے جس کی بنیاد خدا پرستی پر رکھی گئی ہے۔ یہ تمدن کوئی نیا نہیں بلکہ دنیا کئی بار اس کی شعاعوں سے منور ہو چکی ہے۔ اس لیے اگر ہم واقعی اپنے دکھوں کا مداوا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم جدید ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس نئے نظامِ زندگی کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کریں کہ وہ اسے قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے۔

ہمارے نزدیک اس کتاب کا مطالعہ نہایت ہی اہم ہے۔ اس سے یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ دورِ جدید کا انسان اس حسّی تہذیب و تمدن کی گرمی سے خوب تپ چکا ہے اور فلسفہ اور سائنس کے صحراؤں کنارے کی شادابیوں سے گزر کر وسط کی بے آب و گیاہ پہنائیوں تک پہنچنے کے بعد اب اپنے دل میں ایک تڑپ محسوس کر رہا ہے۔ اس کے لب مرگ زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں۔ ع

جگر کی آگ بجھے جس سے وہ شے لا

اسی طرز کی ایک دوسری کتاب انسان نامعلوم (Man the Unknown)
ہے۔ اس کا مصنف (Alexis Carrel) ماہر حیاتیات ہے۔ یہ شخص پہلے مذہب کو
بالکل ایک بیکار سی چیز تصور کرتا تھا مگر ایک مدتِ دراز کی تلاش و جستجو اور غور و فکر کے بعد وہ اس
نتیجہ پر پہنچا ہے کہ دنیا کی نجات اگر کسی ذریعہ سے ممکن ہے تو وہ صرف مذہب کی سچی پیروی ہے۔

نقطۂ نظر کی اس عظیم تبدیلی کا اصلی سبب یہ ہے کہ فاضل مصنف نے ایک گہرے سوچ بچار
کے بعد از خود اس بات کو محسوس کیا ہے کہ انسانی اعمال کے محرکات اور ان کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ
اور الجھی ہوتی ہیں کہ علم کیمیا کی طرح انہیں سادہ اجزا میں تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں ربط و ترتیب
اسی وقت قائم ہوتی ہے جبکہ ان کے احوال و اسباب کے سلسلے کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے۔ ظاہر
ہے کہ اس نفسیاتی جائزہ میں سائنس کی بے لوثی کبھی نہیں آسکتی۔ یہی وجہ ہے انسان کی ناکامی
کی۔ انسان بے جان اور بے ارادہ مادے کی تحقیق میں تو کامیاب ہو گیا ہے مگر اسے اپنے
آپ کا کوئی "سراغ" نہیں ملا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

"اگرچہ ہم تمام ادوار کے سائنس دانوں، فلسفیوں، شاعروں اور عظیم المرتبت صوفیوں
کے مشاہدات سے فراہم کردہ خزانوں کے مالک ہیں مگر ہم ابھی تک انسانی زندگی سے صرف چند گوشوں
کو بے نقاب کر سکے ہیں۔ ہم انسان کو بحیثیت کل کے نہیں سمجھ سکے۔ بلکہ ہم اسے چند باہم دگر
ممتاز اجزا کا مجموعہ سمجھتے ہیں . . . . اپنے متعلق ہماری معلومات بہت ہی کم ہیں"۔

ایک دوسری جگہ وہ سائنس کی ناکامی کا تذکرہ کرتے لکھتا ہے:

"یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ہمارا آلہ ہماری زندگی کی پہنائیوں کا پوری طرح احاطہ
نہیں کر سکتا۔ اس کے پاس جو پیمانے ہیں ان سے صرف انہی چیزوں کی پیمائش کر سکتا ہے
جو حجم یا وزن رکھتی ہیں، یا زمان و مکان کی حدود میں مقید ہیں۔ سائنس کا دیا ہوا معیار
نخوت، نفرت، محبت ایسے احساسات کو جانچنے کے ناقابل ہے"۔

ڈاکٹر موصوف کے ان بیانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے دورِ جدید کے انسان کی اس جسارت

کو ملاحظہ فرمائیے کہ اس نے اپنی زندگی کو اچھی طرح سمجھے بغیر محض حواس خمسہ کے سہارے اپنا سفر شروع کیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی اس کی بربادی کا اصل سبب ہے۔ ان حالات میں جبکہ انسان کا فکر خود اپنی ذات کے بحر بیکراں میں ڈوب کر اس کی وسعتوں کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا یہ ناممکن ہے کہ وہ پوری نوع انسانی کے لیے کوئی ایسا لائحہ عمل پیش کرے جس پر چل کر دنیا کے مختلف انسان خود اپنی زندگیوں کو ہم آہنگ بنا سکیں اور اس طرح پوری نوع انسانی اطمینان کا سانس لے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ باہر سے کوئی علیم و خبیر ہستی انسان کی رہنمائی کرے اور یہ ہستی سوائے باری تعالیٰ کے اور کون ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد مصنف نے دور جدید کے سب سے بڑے فتنے یعنی ماہرین خصوصی Specialists کے فتنہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ عہد حاضر کا انسان کس طرح علوم و فنون کے یک چشم ماہرین کے ہاتھوں میں کھلونا بن کے رہ گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"یہ بات اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ زندگی کے کسی ایک شعبہ کو دوسرے کے مقابلہ میں ناجائز اہمیت دی جاتی ہے۔ حالانکہ ہمارا فرض یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کا مثلاً حیاتیاتی، عضویاتی، نفسیاتی، علمی اور اخلاقی سب کا ایک ساتھ جائزہ لیں۔ آج ہر ماہرِ فن آنکھوں پر تعصبات کی پٹیاں باندھ کر زندگی کو دیکھتا ہے اور اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ تنہا وہی پوری زندگی کو سمجھ سکتا ہے . . . . . بدقسمتی سے اجزا کے متعلق یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ وہی درحقیقت کل ہیں، اور ان اجزا کا انتخاب بھی کسی گہرے سوچ بچار سے نہیں کیا جاتا بلکہ جو کچھ بھی ہمارے جی میں آتا ہے ہم منتخب کر لیتے ہیں"۔

اس فساد کا اگر کوئی صحیح علاج ہے تو یہ کہ ایک تو انسان کا بحیثیت مجموعی مطالعہ کیا جائے اور دوسرے بنی آدم کی توجہ خارجی دنیا سے ہٹا کر "من کی دنیا" کی طرف مبذول کرائی جائے۔ پچھلے دو صدیوں کے تجربات اس حقیقت کی زندہ شہادت ہیں کہ مشینی ایجادات نے دنیا کو کسی طریقہ سے بھی سکون نہیں بخشا۔ وہ بڑے زور سے کہتا ہے:۔

" درحقیقت یہ کوئی مفید صورت نہیں کہ ہم ایک ایسے طریقِ زندگی کو اختیار کرنے کے لیے محنت کریں جو اخلاقی زوال کا، اور بڑی بڑی نسلوں کے صالح ترین عناصر کے خاتمہ کا موجب بن رہا ہے۔ تیز رفتار بحری جہاز، آرام دہ گاڑیاں، سستے ریڈیو اور بعید تر سحابیوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے طاقتور دوربینیں بنانے کی بجائے ہمیں ان قوتوں کو خود اپنے متعلق غور وفکر میں صرف کرنا چاہیے۔"

"تن کی دنیا" میں انسان کے شدید انہماک کا سب سے بُرا اثر انسانی اخلاق پر پڑا ہے۔ علمی تحقیقات اور صنعتی انکشافات جن کی غرض نوعِ انسانی کی بہبودی تھی وہ اب اس کی تباہی کا باعث بن گئی ہیں۔ وہ اپنے علم سے حاصل کی ہوئی طاقت کو خود اپنے خلاف ہی استعمال کر رہا ہے۔ لوگوں کے اندر غلط اور صحیح، حق اور ناحق کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔

اِن حالات میں آج اگر انسانیت اپنی فلاح کی طالب ہے تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ ایک سچّے مذہب کی طرف رجوع کرے۔ مذہب انسان کے اندر ایک بالاتر ہستی کے وجود کا احساس پیدا کرتا ہے، وہ اُس کی نگاہوں کو آخرت کی زندگی پر مرتکز کرکے اس کی عقل، اُس کی قوت، اور اس کے اخلاق کے درمیان توازن و تناسب قائم رکھتا ہے۔ مذہب ہی ہے جو انسان کے ذاتی فوائد و مصالح کو اجتماعی فوائد و مصالح کے ساتھ مربوط و متناسب رکھتا ہے۔ اسی سے انسان کے اندر اپنی قوت و اختیارات پر بجائے فخر و استکبار پیدا ہونے کے عجز و نیاز اور بندگی کی شان پیدا ہوتی ہے۔

یہ ہے خلاصہ ڈاکٹر موصوف کے خیالات کا۔ اس کی یہ تصنیف اس قابل ہے کہ ہم اس کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔

تفہیم القرآن جلد اول طبع دوم

میں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے نظر ثانی فرما کر کئی مقامات میں ترمیم اور اضافہ کر دیئے ہیں۔

طبع دوم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ طبع اول کی غلطیوں کی تصحیح کے علاوہ فہرست موضوعاتی ترتیب سے شامل کر دی گئی ہے

کاغذ اور سامان متعلقہ کی شدید گرانی اور نایابی کے باوجود ہدیہ میں اضافہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ جلد بندی طبع اول سے بھی مضبوط اور اعلیٰ تربیت یافتہ ماہرین سے کرائی گئی ہیں۔

جو جلدیں تیار ہو چکی ہیں۔ یا تیار ہو رہی ہیں ان کا ہدیہ حسب ذیل ہے۔

قسم اول مع بکس ۲۰/۱۲	خصوصی جلد ۲۲/۱۲	مطلا جلد ۲۸/۱۲
قسم دوم " " ۱۸/۴	خصوصی جلد ۲۰/۱۲	مطلا جلد ۲۶/۱۲
قسم سوم بغیر بکس ۱۱	۱۱/۱۲	خصوصی ۱۲/۴

۴ آنے زاید صرف کرنے پر قسم سوم میں بکس بھی مل سکتا ہے۔

ضروری نوٹ: جلد بندی کے سامان کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے باوجود اس وقت تک گرانی کے تمام بوجھ ہم نے برداشت کئے ہیں۔ اور ہدیہ میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ جس طرح اور جس قیمت پر بھی سامان متعلقہ فراہم ہو سکا استعمال کر کے بغیر اضافہ کے فرمایشوں کی تعمیل کی جا رہی ہے۔ تیار اور زیر تیار جلدیں انہی ہدیوں پر بھیجی جائیں گی۔ جن کی تعداد ۵-۶ سو کے درمیان ہے۔ ان کے ختم ہونے کے بعد مارکیٹ میں گرانی کی رفتار یہی رہی تو ہمارے لیے ہدیہ میں اضافہ کرنا ناگزیر ہو گا جس کا بعد میں اعلان کر دیا جائیگا۔

اپنی فرمائشیں ناظم مکتبہ تعمیر انسانیت ۲۵ گجر گلی موچی دروازہ لاہور ــــ یا مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان۔ اچھرہ۔ لاہور کو روانہ فرمائیں

اختلافی مسائل پر امت سازی کا فتنہ

سوال :- مجھے مذہبی تنازعات اور تفرقے سے فطری بُعد ہے اور وہ تمام جزئی مسائل جن میں اختلاف کرنے کی گنجائش خود شریعت میں موجود ہے ان میں اختلاف کو جائز رکھتا ہوں۔ اسی طرح اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معاملہ میں دو یا تین طریقہ ہائے عمل ثابت ہوں تو ان سب کو جائز اور سنت کی حد کے اندر شمار کرتا ہوں۔ مثلاً نماز میں رفع یدین کرنا اور نہ کرنا میرے نزدیک دونوں برابر ہیں، چنانچہ میں ان دونوں صورتوں پر عمل کرتا ہوں۔ کبھی اس پر اور کبھی اس پر۔ مجھے اپنے اس مسلک پر پورا پورا اطمینان ہے اور میں نے اسے سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ مگر والد محترم نے جو رکن جماعت بھی ہیں محض نماز میں رفع یدین کا التزام چھوڑ دینے کی وجہ سے مجھے یہ نوٹس دے دیا ہے کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو پھر ہمارے تمہارے درمیان سلام کلام کا تعلق برقرار نہیں رہ سکتا۔ میں نے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب یہ قضیہ میرے اور والد محترم کے حلقۂ تعارف میں بحث کا موضوع بن گیا ہے اور دونوں کی تائید اور تردید میں لوگ زور استدلال صرف کر رہے ہیں۔ مجھ پر جو بے سروپا اعتراضات ہو رہے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ تو حنفی ہو گیا ہے، تیرا دو طریقوں پر عمل کرنا دورُخی اور نفاق ہے، تم جماعت کی اکثریت سے مرعوب ہو گئے ہو، تمہارا اصل مقصود طلب زر اور حصولِ عزت ہے، تمہیں احناف نے یہ پٹی پڑھائی ہے، تو مودودی صاحب کا مقلد ہے، وغیرہ۔ ان اعتراضات میں سے دلچسپ ترین تو یہ تھا کہ ہمیں پہلے ہی مودودی صاحب سے یہ اندیشہ تھا کہ وہ جماعت اسلامی کے نام پر اہل حدیث کو حنفی بنا کے رہیں گے، چنانچہ یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ یعنی پہلے پہل تو اس جماعت میں آنے والے سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا فقہی مسلک جماعت میں آنے کے بعد بھی برقرار رہے گا، مگر جماعت میں آنے کے بعد ایسے طریقوں سے کام لیا جاتا ہے کہ کسی شخص کو خود کوئی احساس بھی نہیں ہوتا اور اس کا مسلک سراسر بدل جاتا ہے۔ میں سب پر فرداً فرداً ان سب اعتراضات کے جواب دیتا رہا ہوں، لیکن پھر بھی اپنے اطمینان کے لیے حسبِ ذیل امور کی وضاحت چاہتا ہوں:-

۱- والدین کے حقوق کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟ کیا وہ اولاد سے مسائل کی تحقیق کا اور اپنی تحقیق کے مطابق عمل کرنے کا حق بھی سلب کر سکتے ہیں؟ کیا والدین کی مرضی کے خلاف مسلک اہل حدیث کی خلاف ورزی (یعنی ترک رفع یدین) کرنے پر "سخط الرب فی سخط الوالدین" کی وعید کا مستوجب ہو جاؤں گا؟

۲- از روئے شریعت نماز میں رفع یدین کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا ترک رفع سے آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے؟

۳- کیا ایک رکن جماعت دوسرے رکن سے اس بنا پر مقاطعہ کر سکتا ہے کہ اس نے مزعومہ مسلک اہل حدیث کی خلاف ورزی کی ہے؟

جواب :- جس نزاع کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس کا حال پڑھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔ مجھ کو اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی کہ ہماری جماعت میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے جو فقہی مسائل میں تعصب و تشدد کی اس حد کو پہنچے ہوئے ہوں گے اگر آپ جیسا معتمد علیہ آدمی ان حالات کا راوی نہ ہوتا اور ایک دوسری اطلاع سے آپ کی تائید نہ ہو گئی ہوتی تو شاید

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi —This treatise deals with nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & its Islamic Solution** —By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism what ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE

(Pakistan)

دعوت دین اور اس کا طریق کار

از مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا اصلاحی نے اس کتاب میں ایک طرف تو موجودہ طریقہ تبلیغ کی خامیوں کو واضح کیا ھے، اور دوسری طرف انبیا علیہم السلام کے طریقہ تبلیغ، طریقہ تربیت اور دعوت دین کے مکمل طریق کار پر مفصل اور مدلل روشنی ڈالی ھے۔

جو لوگ اسلام کو ایک ھمہ گیر نظام زندگی کی حیثیت سے پھر زندہ و کارفرما دیکھنا چاھتے ھیں اور اس مقصد کے لئے اسی طریقہ پر کام کرنے کو صحیح سمجھتے ھیں جو انبیائے کرام نے اپنے اپنے زمانے میں ھدایت خداوندی کے تحت اختیار کیا تھا، اس کتاب میں اپنے لئے بہت کچھ پائیں گے، اور اس کے مطالعے سے محسوس کرینگے کہ ان کی راہ کے بہت سے پتھر ھٹ گئے ھیں اور بہت سی تاریک راھیں روشن ھو گئی ھیں۔

پاکستان — جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اور جسکو قرارداد مقاصد کے ذریعہ اسلام کے نظام زندگی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ھے، اس بات کا حقدار ھے کہ اس کے باشندے اپنے اندر ان صفات کو پرورش دیں جو اسلام کی دعوت کے لئے ضروری ھیں، تا کہ وہ اسلام کو صرف اپنے ملک میں حاکم وحاوی بنانے کی جد و جہد کریں بلکہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے لئے بھی مشعل راہ بن سکیں۔

ھمیں توقع ھے کہ یہ کتاب اس مقصد میں مدد گار ثابت ھو گی

جلد شائع ھو رھی ھے

ارتداد کی سزا

اسلامی قانون میں

از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتابچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ھے جو مولانائے محترم نے وقتاً فوقتاً رسالہ ترجمان القرآن میں لکھے تھے۔

مسلمانوں نے مغرب سے مرعوب ھو کر اسلام کے جن مسائل کو شبہہ اور شرم کے ملے جلے جذبات سے دیکھا اور شکست خوردہ ذھنیت کے لوگوں نے جنکو اسلام سے خارج ھی سمجھنا شروع کر دیا ان مسائل میں سے ایک مسئلہ ارتداد کا ارتکاب کرنے والے کی سزا سے بھی متعلق تھا۔

مولانا مودودی نے اس مسئلہ پر پوری مدلل روشنی ڈالی ھے اور اس کا مطالعہ علم سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے ھر شخص کے لئے مفید ثابت ھوگا۔

جلد شائع ھورھی ھے

ملنے کا پتہ:

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ۔ لاھور۔ پاکستان

سرورق ریبن پریس لاھور میں چھپا